Dr.Shyama Prasad Mukherjee University,Ranchi

MA Semester-2

Sub:- Urdu, 201

مندرجہ ذیل سوالات کے جواب دیجئے۔

-1 اردو مرثیہ نگاری کی ابتدا کس صدی میں ہوئی ؟

(الف) پندرہویں (ب) سولہویں (ج) اٹھارہویں

-2 اردو کا پہلا مرثیہ نگار کسے تسلیم کیا جاتا ہے؟

(الف) وجہی (ب) نصرتی (ج) اشرف بیابانی

-3 ان میں کون مرثیہ نگار نہیں ہے؟

(الف) ذوق (ب) انیس (ج) دبیر

-4 اردو میں مرثیہ نگاری کی ابتدا کہاں سے ہوئی ؟

(الف) دلی (ب) لکھنؤ (ج) دکن

-5 میر انیس کہاں پیدا ہوئے ؟

(الف) فیض آباد (ب) دلی (ج) لکھنؤ

-6 میر انیس کے والد کا کیا نام تھا؟

(الف) میر ضمیر (ب) میر مستحسن خلیق (ج) میر حسن

-7 مرثیہ کے کتنے اجزائے ترکیبی ہیں؟

(الف) پانچ (ب) سات (ج) آٹھ

-8 مرزا دبیر اور میر حسن کی پیدائش کہاں ہوئی ؟

(الف) لکھنؤ　　　(ب) دلی　　　(ج) مرادآباد

9- ان میں کون سا جز و مرثیہ کا نہیں ہے؟

(الف) آمد　　　(ب) سراپا　　　(ج) گریز

10- سب سے پہلے مسدس کی ہیئت میں مرثیہ کس نے لکھا؟

(الف) انیس　　　(ب) سودا　　　(ج) مرزا دبیر

درج ذیل سوالوں کا جواب دیں۔

11 مرثیہ کی تعریف اور اس کے اجزائے ترکیبی پر ایک نوٹ لکھیے۔

12 فن مرثیہ نگاری سے اپنی واقفیت کا اظہار کیجیے۔

13 اردو مراثی میں تہذیبی عناصر کی نشان دہی کیجیے۔

14 اردو مرثیوں کے جمالیات محاسن پر اپنے خیالات کا اظہار کیجیے۔

15 میر انیس کی حالات زندگی پر ایک مقالہ لکھیے۔

16 انیس کے مرثیوں کی خصوصیات تفصیل سے لکھیے۔

17 اردو مرثیہ کے ارتقا پر ایک نوٹ لکھیے۔

18 مرزا دبیر کی حالات زندگی تحریر کیجیے۔

19 مراثی دبیر کی خصوصیات سپرد قلم کیجیے۔

20- اردو مرثیہ نگاری میں انیس و دبیر کا تقابلی مطالعہ پیش کیجیے۔

مرثیہ کی تہذیبی اور تمدنی اہمیت کے علاوہ اس کی ادبی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ مرثیہ کی مقبولیت کا راز جہاں مذہب سے وابستگی ہے وہیں تہذیبی اخلاقی اور ادبی محاسن میں بھی مضمر ہے۔ اس کی مقبولیت کے کئی اسباب ہیں جن میں سے زیادہ موثر اور مقبول عام سبب مرثیہ کی جذباتی اور مذہبی نوعیت ہے۔ مرثیہ گویوں، خصوصاً انیس و دبیر نے اپنی بے پناہ تخلیقی قوت سے مرثیہ کو اعلیٰ و عظیم شاعری کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔ جس کی مثال عالمی ادب میں بھی نہیں مل سکتی۔ ان ہی مرثیہ نگاروں نے انسانی رشتوں، جذبات و احساسات کی آفاقیت، جمالی اقدار اور شعر کے جملہ محاسن کو پیش نظر رکھا، جس کی وجہ سے ادبی ذوق کی بھی تسکین ہوتی ہے۔

9.2 مرثیہ کا فن

مسدس، مرثیے کی انتہائی ترقی یافتہ شکل ہے۔ ابتدا میں مرثیہ دو بیتی، مثلث، مربع اور مخمس میں بھی لکھا گیا۔ سودا نے مرثیہ کو مسدس کی شکل میں روشناس کروایا۔ سودا سے قبل بھی مسدس کے فارم میں مرثیے لکھے گئے۔ میر تقی میر، سکندر پنجابی، احمد اور حیدر دکھنی نے کچھ مرثیے مسدس ہی میں لکھے تھے۔ سودا کے بعد بھی مرثیے کے لیے دیگر ہیئتیں استعمال کی گئیں۔ مثلاً غالب نے عارف کے مرثیے میں غزل کا فارم اختیار کیا۔ حالی نے غالب کا مرثیہ لکھا تو ترکیب بند میں اور اقبال نے والدہ کا مرثیہ مثنوی کی شکل میں لکھا۔ محمد علی جوہر، سیماب اکبر آبادی اور حفیظ جالندھری نے مرثیے کے لیے غزل، قطعات اور مخمس کی ہئیتیں اختیار کیں۔ ان مثالوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مرثیے کے لیے کوئی ہیئت مخصوص نہیں، لیکن انیس اور دبیر کے مرثیوں کی مقبولیت کی وجہ سے مسدس کے فارم کو مرثیہ سے مخصوص سمجھا جانے لگا ہے۔

9.2.1 مرثیے کے اجزائے ترکیبی

مرثیہ چونکہ واقعات کربلا پر مبنی ہے اس لیے اس میں واقعاتِ کربلا کی تفصیل بیان ہوتی ہے۔ مثلاً جاں نثارانِ حسینؑ اور خانوادہ حسینؑ کی سیرت و شخصیت، کردار، جذبات، احساسات، اعزہ سے رخصتی، میدانِ کارزار میں ان بے سروساماں فدائیاں حسینؑ کی آمد، آلاتِ حرب، جنگ کا منظر، گھوڑوں کی تیزی، تلواروں و نیزوں کی چمک دمک، فرات کے کناروں پر یزیدیوں کے پہرے، پیاسوں کی شہادت اور پھر ان کی زخم خوردہ لاشوں پر بین و بکا وغیرہ۔ ان واقعات و بیانات میں ایک منطقی ربط و تسلسل قائم رکھنے کی خاطر مرثیے کے لیے آٹھ اجزائے ترکیبی وضع کیے گئے:

(1) چہرہ	(2) سراپا	(3) رخصت	(4) آمد
(5) رجز	(6) رزم	(7) شہادت	(8) بین

مرثیے میں اجزائے ترکیبی کا یہ تعین استادِ دبیر میر ضمیر نے کیا۔ لیکن اس کی پابندی پوری طرح نہیں ہوسکی۔ خود ضمیر اور بعد میں انیس و دبیر کے یہاں بھی اس کی پابندی نہیں ہوسکی۔ مثلاً مرزا سلامت علی دبیر کا ایک مشہور مرثیہ ہے ''کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے''۔ یہ مرثیہ 'آمد' سے شروع ہوتا ہے۔

9.2.2 چہرہ

مرثیے میں چہرہ 'قصیدہ کی تشبیب کی طرح ہوتا ہے۔ جس میں شاعر حمد، نعت، منقبت حضرت علیؑ و امام حسینؑ کے علاوہ مکہ سے سفر، سفر کے پُرخطر حالات، گرمی کا موسم، صبح کا موسم بیان کرتا یا پھر اپنی شاعرانہ عظمت، قادر الکلامی، ثنا خوان حسین ہونے پر فخر کا اظہار کرتا ہے۔ کبھی پیاس کی کیفیت بھی بیان کرتا ہے۔ عموماً موسم کے بیان میں گرمی کی شدت، صبح کا منظر، چڑیوں کی چہچہاہٹ، شبنم کا پھولوں پر گہر آبدار بن کر چمکنا وغیرہ قسم کے مناظر تشبیہ و استعارے اور صنائع بدائع کی زرتابی کے ساتھ قلم بند کرتے ہیں۔ انیس کے ایک مشہور مرثیے میں صبح کا منظر اس طرح بیان کیا گیا ہے:

وہ دشت، وہ نسیم کے جھونکے، وہ سبزہ زار
پھولوں پہ جا بجا وہ گہر ہائے آبدار
اٹھنا وہ جھوم جھوم کے شاخوں کا بار بار
بالائے نخل ایک جو بلبل تو گل ہزار
خواہاں تھے زیبِ گلشنِ زہرا جو آب کے
شبنم نے بھر دیے تھے کٹورے گلاب کے

9.2.3 سراپا

عموماً یہ ایک طرح سے انصار حسینؑ کا تعارف ہوتا ہے۔ کبھی کبھی لشکر یزید کے ساتھیوں کا بھی سراپا لکھا گیا ہے۔ سراپا لکھنے میں شاعر اپنا زور قلم صرف کر دیتا ہے، جس سے شاعر کی اپنی محبت وعقیدت کا بھرپور اظہار ہوتا ہے تو دوسری طرف باطل یعنی یزیدیوں سے تنفر کا احساس ہوتا ہے۔ سراپا بیان کرتے وقت تشبیہات و استعارات سے مدد لی جاتی ہے۔ صنائع بدائع کے خزانے لٹا دیے جاتے ہیں۔ دبیر نے ایک مرثیے میں بالکلیہ ہی علاحدہ انداز میں تصویر کشی کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ تشبیہ کہاں سے لاؤں جو حسنِ حسینؑ کی تابش کو سہار سکے۔ کہتے ہیں کہ رُخ کو آئینہ کہوں تو سمجھو کہ میں نے کچھ بھی ثنا نہیں کی، آنکھ کو نرگس کہوں تو ان آنکھوں کے لیے کسر شان ہے کیونکہ نرگس میں نہ پلکیں ہیں نہ پتلی نہ بصارت۔

آئینہ کہا رُخ کو تو، کچھ بھی نہ ثنا کی
صنعت وہ سکندر کی، یہ صنعت ہے خدا کی
گر آنکھ کو نرگس کہوں، ہے عین حقارت
نرگس میں نہ پلکیں ہیں، نہ پتلی، نہ بصارت

9.2.4 رُخصت

میدان جنگ میں جانے کے لیے خیمۂ حسین سے ایک بعد دیگرے جانباز، سر پر کفن باندھ کر نکلتے ہیں تو خیمے میں مکیں، متعلقین اور مستورات انہیں بہ دلِ بریاں، بہ چشمِ گریاں، بہ لبِ لرزاں مگر بھرپور قوت ایمانی کے ساتھ رخصت کرتے ہیں۔ اہلِ خیمہ کو یقین ہے کہ یہ اب زندہ واپس نہیں آئیں گے۔ اس موقع پر وداع کرنے والے عزیزوں اور پیاروں کے جذباتِ محبت اور قوتِ ایمانی کے جو مرقعے مرثیوں میں کھینچے گئے ہیں وہ پڑھنے کے لائق ہیں۔

9.2.5 آمد

میدان جنگ میں آمد کا منظر زیادہ طویل نہیں ہوتا۔ یہ بند رخصت اور رجز سے جڑا ہوا ہوتا ہے۔ کبھی کبھی آمد کے موقع پر گھوڑے کی تعریف بھی کی جاتی ہے۔

9.2.6 رَجز

عربوں میں رواج تھا کہ دو حریف جب میدان جنگ میں آمنے سامنے ہوتے تو جنگ شروع ہونے سے قبل ایک دوسرے کو للکارتے، اپنی اور اپنے آبا واجداد کی شجاعت، طاقت اور خاندانی عظمت، دین داری وقوت ایمانی وغیرہ کا ذکر کرتے تھے، جس میں جوش، غضب اور ولولہ ہوتا تھا۔ اس اظہار کو جو فصاحت و بلاغت کا مرقع ہوتا ہے اصطلاحاً ''رجز'' کہتے ہیں۔ کبھی مرثیہ نگاروں نے اس حصے میں بلاغت وفصاحت کے دریا بہا دیے ہیں۔ انیس کے ایک مرثیے سے رجز کا ایک بند ملاحظہ ہو۔ یہ رجز حضرت امام حسینؑ کی زبانی ہے۔

دنیا ہو اک طرف تو لڑائی کو سر کروں
آئے غضب خدا کا اُدھر، رخ جدھر کروں
بے جبرئیل کار قضا و قدر کروں
اُنگلی کے اک اشارے میں شق القمر کروں
طاقت اگر دکھاؤں، رسالت مآبؐ کی
رکھ دوں زمین پہ چیر کے ڈھال آفتاب کی

9.2.7 رزم

یہ مرثیے کا نہایت ہی اہم حصہ ہوتا ہے جس میں شاعر میدان جنگ کی تیاری' فوجوں کے سازو سامان' گھوڑوں کی تعریف' ان کا غیض وغضب' براق کی سی تیز رفتاری' تلواروں کی چمک' نیزوں کی کڑک' سپاہیوں کی پھرتی' بے جگری سے لڑائی' جاں توڑ مقابلہ وغیرہ' ان تمام حالتوں اور کیفیتوں کو بڑی خوبی سے بیان کرتا ہے' جس سے اُس کی بلندیٔ خیال اور قوتِ اظہار کا پتہ چلتا ہے۔ یہ اشعار دیکھیے جن میں میدان جنگ کی تصویر ہو بہو سامنے آجاتی ہے۔

نیزے ہلے' وہ چل گئیں چوٹیں کہ الاماں — ہر طعن قہر کی تھی' قیامت کی ہر تکاں
چنگاریاں' اڑیں جو سناں سے لڑیں سناں — دو اژدہے گتھے تھے' نکالے ہوئے زباں

پھیلے شرر پرندوں کی جانیں ہوا ہوئیں
شمعوں کی تھیں لویں کہ ملیں اور جدا ہوئیں

9.2.8 شہادت

مرثیوں میں یہ حصہ بھی بڑا جاندار ہوتا ہے کیوں کہ اسی بیان پر بین کی شدت کا انحصار ہوتا ہے۔ اس حصے میں فوج حسینی کے شہید کی میدان میں جراءت' بہادری اور فن سپاہ گری کے کمالات بیان کرتے ہوئے زخموں سے چور چور نڈھال ہو کر گر جانے اور شہادت پانے کا ذکر آتا ہے۔ یہ مرثیہ کا بڑا دلدوز حصہ ہوتا ہے۔ حضرت علی اکبر کی شہادت پر امام حسینؑ کا حال زار اور کیفیت انیس اس طرح بیان کرتے ہیں:

حضرت یہ کہتے تھے کہ چلا خلق سے پسر — اتنی زباں ہلی کہ خدا حافظ اے پسر
ہچکی جو آئی' تھام لیا ہاتھ سے جگر — انگڑائی لے کے رکھ دیا شہ کے قدم پہ سر

آباد گھر لٹا شہ والا کے سامنے
بیٹے کا دم نکل گیا بابا کے سامنے

9.2.9 بین

مرثیہ کا آخری جزو بین ہوتا ہے' جس میں مجاہد کی شہادت اور لاش کو خیمے میں لانے' خواتین کے رنج و الم اور بین و بکا کے جذبات کی عکاسی کی جاتی ہے۔ یہی دراصل مرثیے کا مقصد و منشا ہوتا ہے۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ اس حصے کو اتنا پُر اثر اور جاندار بنادے کہ مجلس برپا ہوجائے۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. مرثیے کے اجزائے ترکیبی کتنے ہیں؟
2. رجز سے کیا مراد ہے؟
3. چہرہ قصیدہ کے کس جز کی طرح ہے۔؟

9.3 مرثیے کی ادبی اہمیت

کہنے کو مرثیہ شہدائے کربلا اور واقعات کربلا کے حالات بیان کرنے لکھا جاتا ہے' لیکن مرثیہ گو کی شانِ تخلیق اور قوت اظہار سے مرثیہ ایک ادبی شہکار بن جاتا ہے۔ اس ادبی شہکار میں وحدت میں کثرت کے جلوے نظر آتے ہیں۔ اس میں قصیدے کی شان و شکوہ' جلالت و بلاغت ہوتی ہے۔ مثنوی کی سادگی و سلاست اور قصہ پن' منظر نگاری' جذبات نگاری' واقعہ نگاری' کردار نگاری' سراپا نگاری' مکالمہ نگاری' محاکات کے جاندار وسیع و ہمہ گیر مرقعے نظر آتے ہیں۔ کردار نگاری میں عموماً انیس نے اس بات کا لحاظ رکھا ہے کہ مکالمے کردار سے مطابقت

Scanned with CamScanner

رکھتے ہوں۔ صغریٰ، سکینہ، عون و محمد بچے ہیں تو وہ بچوں کی سی باتیں کرتے ہیں۔ حضرت عباس غصہ ور جوان ہیں تو وہ جوشیلی گفتگو کرتے ہیں، عورتیں اپنے لب و لہجے روزمرہ و محاوروں کا استعمال کرتی ہیں۔ مرثیوں سے تشبیہ و استعارے کے خزانے میں بیش بہا اضافہ ہوا ہے۔ زندگی میں بعض مواقع آتے ہیں کہ آدمی کی قوت گویائی ساتھ نہیں دیتی۔ مرثیہ گویوں نے ایسے نازک موقعوں پر الفاظ کے موتی لٹا دیے ہیں۔ حسن تعلیل کی ایک خوبصورت مثال دیکھیے:

پیاسی جو تھی سپاہ خدا تین رات کی
ساحل سے سر پٹکتی تھیں موجیں فرات کی

صنعت غیر منقوط کی ایک دلچسپ مثال یہ ہے:

حُر حملہ ور ہوا کہ اسد حملہ ور ہوا — وہ حملہ ور اِدھر اُدھر اسلام ور ہوا
سرگرم معرکہ سرا اعدا اگر ہوا — وہ گل کھلا کہ لالۂ کہسار سر ہوا
اہل حسد کو درس اِدھر آہ آہ کا
حورو ملک کو درد اُدھر واہ واہ کا

اپنی معلومات کی جانچ:

1. مرثیہ ادبی شہکار کس طرح بنتا ہے؟
2. صنعت غیر منقوط سے کیا مراد ہے؟ ایک چھوٹا سا غیر منقوط جملہ لکھیے۔

9.4 تہذیبی اہمیت

آج بھی لکھنؤ دبستان کا ذکر آتا ہے تو وہاں کے عیش و عشرت، طوائف بازی، مرغ بازی، کبوتر بازی، کھیل کود میلے ٹھیلوں کا تذکرہ اس طرح آتا ہے جیسے لکھنؤ میں اور کچھ نہیں تھا سوائے بازار عیش کے۔ اسی اعتبار سے لکھنؤ کے شعری سرمایہ کو خارجیت سے مملو ہونے کا بہتان تراشا گیا ہے۔ پاکیزگی، دردمندی، دل سوزی جیسے وہاں کی شاعری میں عنقا ہو۔ لکھنو کا مذہبی ماحول مجلس عزا کی کثرت اور اس کے ساتھ عوام و خواص کی قدردانی بھی لکھنؤ کی تہذیب میں شامل ہے۔ مرثیہ نگاروں نے لکھنوی تہذیب کی بہترین عکاسی کی ہے۔ وہاں آداب، اخلاق، رہن سہن، طور طریق خواتین کے لباس، ان کی زبان، زیورات، لباس وغیرہ کی دلنشیں اور دلچسپ تصویریں پیش کردی ہیں، مثال کے طور پر دبیر کے مرثیے سے ایک بند پیش ہے جس میں بی بی کی سواری کا منظر کھینچا گیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ کیسی پوشاک تھی، کیسے زیور تھے، اور کیسی سواری تھی۔

مری بی بی کی امیرانہ سواری ہوگی — ناقے پر عرش کے مانند عماری ہوگی
مسند نور پہ کبریٰ کی وہ پیاری ہوگی — گہنا سب تحفہ تو پوشاک بھی بھاری ہوگی
بیرقیں نور کی ہاتھوں میں کشادہ ہوں گی
فوجیں حوروں کی سواری میں پیادہ ہوں گی

تصویر کی اسی لطافت نے عملی صورت بھی اختیار کرلی۔ استقبال کسی عظیم ہستی کا کس طرح ہوتا ہے دیکھیے:

مسند آراستہ کی سبط پیمبر کے لیے — کشتیاں لا کے رکھیں عزت حیدر کے لیے
جھولا دالان میں ڈالا علی اصغر کے لیے — لا کے گلدستے برابر رکھے اکبر کے لیے
جام شربت کے بھرے ابن حسن کی خاطر
گہنا پھولوں کا منگا رکھا دلھن کی خاطر

رکھتے ہوں۔ صغریٰ، سکینہ، عون و محمد بچے ہیں تو وہ بچوں کی سی باتیں کرتے ہیں۔ حضرت عباس غضنفر جوان ہیں تو وہ جوشیلی گفتگو کرتے ہیں، عورتیں اپنے لب و لہجے روز مرہ و محاوروں کا استعمال کرتی ہیں۔ مرثیوں سے تشبیہ و استعارے کے خزانے میں بیش بہا اضافہ ہوا ہے۔ زندگی میں بعض مواقع آتے ہیں کہ آدمی کی قوت گویائی ساتھ نہیں دیتی۔ مرثیہ گویوں نے ایسے نازک موقعوں پر الفاظ کے موتی لٹا دیے ہیں۔ حسن تعلیل کی ایک خوبصورت مثال دیکھیے:

پیاسی جو تھی سپاہ خدا تین رات کی
ساحل سے سر پٹکتی تھیں موجیں فرات کی

صنعت غیر منقوط کی ایک دلچسپ مثال یہ ہے:

حُر حملہ ور ہوا کہ اسد حملہ ور ہوا — وہ حملہ ور اِدھر اُدھر اسلام ور ہوا
سرگرم معرکہ سرا اعدا اگر ہوا — وہ گل کھلا کہ لالۂ کہسار سر ہوا
اہل حسد کو درس اِدھر آہ آہ کا
حورو ملک کو درد اُدھر واہ واہ کا

اپنی معلومات کی جانچ:

1. مرثیہ ادبی شہکار کس طرح بنتا ہے؟
2. صنعت غیر منقوط سے کیا مراد ہے؟ ایک چھوٹا سا غیر منقوط جملہ لکھیے۔

9.4 تہذیبی اہمیت

آج بھی لکھنؤ دبستان کا ذکر آتا ہے تو وہاں کے عیش و عشرت، طوائف بازی، مرغ بازی، کبوتر بازی، کھیل کود میلے ٹھیلوں کا تذکرہ اس طرح آتا ہے جیسے لکھنؤ میں اور کچھ نہیں تھا سوائے بازار عیش کے۔ اسی اعتبار سے لکھنؤ کے شعری سرمایہ کو خارجیت سے مملو ہونے کا بہتان تراشا گیا ہے۔ پاکیزگی، دردمندی، دل سوزی جیسے وہاں کی شاعری میں عنقا ہو۔ لکھنو کا مذہبی ماحول مجلس عزا کی کثرت اور اس کے ساتھ عوام و خواص کی قدردانی بھی لکھنؤ کی تہذیب میں شامل ہے۔ مرثیہ نگاروں نے لکھنوی تہذیب کی بہترین عکاسی کی ہے۔ وہاں آداب، اخلاق، رہن سہن، طور طریق خواتین کے لباس، ان کی زبان، زیورات، لباس وغیرہ کی دلنشیں اور دلچسپ تصویریں پیش کردی ہیں، مثال کے طور پر دبیر کے مرثیے سے ایک بند پیش ہے جس میں بی بی کی سواری کا منظر کھینچا گیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ کیسی پوشاک تھی، کیسے زیور تھے، اور کیسی سواری تھی۔

مری بی بی کی امیرانہ سواری ہوگی — ناقے پر عرش کے مانند عماری ہوگی
مسند نور پہ کسریٰ کی وہ پیاری ہوگی — گہنا سب تحفہ تو پوشاک بھی بھاری ہوگی
بیرقیں نور کی ہاتھوں میں کشادہ ہوں گی
فوجیں حوروں کی سواری میں پیادہ ہوں گی

تصویر کی اسی لطافت نے عملی صورت بھی اختیار کرلی۔ استقبال کسی عظیم ہستی کا کس طرح ہوتا ہے دیکھیے:

مسند آراستہ کی سبط پیمبر کے لیے — کشتیاں لاکے رکھیں عزت حیدر کے لیے
جھولا دالان میں ڈالا علی اصغر کے لیے — لا کے گلدستے برابر رکھے اکبر کے لیے
جام شربت کے بھرے ابن حسن کی خاطر
گہنا پھولوں کا منگا رکھا دلھن کی خاطر

Scanned with CamScanner

... دینا چاہتی اور ساتھ ہی ساتھ بچوں کو سمجھاتی بھی ہے۔ بھائی کے استحقاق کا خیال بھی ہے۔ موقع وہ ہے کہ حضرت عباس کو منصبِ علمداری عطا ہو چکا ہے اور حضرت عون و محمد کو اس کا ملال ہے۔ ان کا خیال ہے کہ انہیں علم ملنا چاہیے۔ صرف ایک بند درج کیا جاتا ہے:

عمریں قلیل اور ہوسِ منصبِ جلیل
اچھا نکالو قد کے بھی بڑھنے کی کچھ سبیل
ماں صدقے جائے گرچہ یہ ہمت کی ہے دلیل
یاں اپنے ہمسروں میں تمہارا نہیں عدیل
لازم ہے سوچے، غور کرے، پیش و پس کرے
جو ہو سکے نا، کیوں بشر اس کی ہوس کرے

یہ جو مثالیں پیش کی گئیں اور جن انسانی رشتوں کا ذکر کیا گیا، وہ سارے رشتے عالمی ادب کی کسی صنف میں ایک جگہ نہیں ملتے۔ اردو میں بھی مرثیہ کے علاوہ رشتوں کی یہ تفصیلات اور کسی صنف میں نہیں ہیں۔ اس لیے کہ غزل کا عاشقانہ مزاج، قصیدہ کی درباداری اور مثنوی کا داستانی رنگ، سماجیات کے اس نازک پہلو کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر مرثیے میں وہ سارے انسانی اقدار موجود ہیں جو کاروانِ تہذیب کو آگے بڑھاتے ہیں۔ کیا مجال کہ مرثیہ نگار کے قلم کو ہلکی سی لغزش بھی ہو جائے۔ مرثیے کی اہمیت اور انفرادیت کے اسباب میں سے یہ بھی ایک سبب ہے کہ مرثیہ نگار اپنے اوپر خوبصورت تہذیبی پابندیاں عائد کر لیتا ہے اور پھر ان کے حصار سے باہر قدم نہیں نکالتا۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. لکھنوی دبستان کی شاعری پر کس طرح کا بہتان لگایا جاتا ہے؟
2. مرثیے میں کون کون سی تہذیبی علامتیں ملتی ہیں؟
3. مرثیوں میں رشتوں کی اہمیت کس طرح سامنے آتی ہے؟
4. قصیدے میں...... پائی جاتی ہے۔ (1) درباداری (2) داستانوی فضا (3) بازاری ماحول

9.5 جمالیاتی اقدار

عام طور سے مرثیوں کی مقدس المناک فضا میں اُن جمالیاتی قدروں کی گنجائش نہیں ہوتی جو غزل یا عشقیہ مثنویوں میں دکھائی دیتی ہے۔ لیکن مرثیہ نگاروں نے جناب قاسم اور حضرت کبریٰ کی شادی کے واقعہ کا سہارا لیتے ہوئے اتنی صحت مند بالیدہ اور خوبصورت تصویریں پیش کی ہیں کہ جن سے تزکیہء نفس اور قلب کی منزلیں طے ہوتی نظر آتی ہیں۔ اس سلسلے میں کئی مرثیے ہیں بالخصوص:

پھولا شفق سے چرخ پہ جب لالہ زار صبح

شہرت رکھتا ہے۔ اپنی بات کی وضاحت کے لیے ایک بند بھی درج کیا جاتا ہے۔ جناب قاسم میدانِ جنگ میں جانے کے لیے اپنی زوجہ فاطمہ کبریٰ کے پاس رخصت ہونے آتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

Scanned with CamScanner

گھونگھٹ ہٹا کے ہم کو دکھا دو تو رخ کا نور | پاس اب نہ آسکیں گے کہ ہوتے ہیں تم سے دور
آنکھوں پہ ہیں ہتھیلیاں رقت کا ہے وفور | نرگس کے پھول ہاتھوں سے ملنا یہ کیا ضرور
جینے کی اب خوشی چمن دل سے فوت ہے
بلبل جو گل کی شکل نہ دیکھے تو موت ہے

اپنی معلومات کی جانچ:

1. حضرت قاسم اور حضرت کبریٰ کے واقعے سے کس انسانی جذبہ کا احساس ہوتا ہے؟
2. حضرت قاسم کی شادی کے سلسلے میں کون سا مرثیہ شہرت رکھتا ہے؟

9.6 اعلیٰ اخلاقی اقدار

مرثیوں کی دنیا میں ایک خاندان اور وسیع تر سماج کی تشکیل کرنے والے انسانی رشتوں کے ان تصورات سے یہ نکتہ سامنے آتا ہے کہ ایک تہذیب یافتہ اور مہذب سوسائٹی اس باہمی ارتباط اور رشتوں کی نزاکت کی بنیاد پر جن اعلیٰ اخلاقی اقدار کی حامل اور امین ہوتی ہے دراصل وہی اخلاقیات کا روشن ترین باب ہیں۔ ان رشتوں میں جو کردار سامنے آتے ہیں ان میں جناب حبیب ابن مظاہر، حضرت زہیر ابن قین اور وہ گمنام مسافر جو مرثیے

جب نوجواں پسر شہ دیں سے جدا ہوا

میں نظر آتا ہے، رشتوں کی اخلاقی فضا کو بلندیاں عطا کرتا ہے۔

مرثیے کی اہمیت اور مقبولیت میں جہاں انسانی رشتہ اہم ترین حیثیت رکھتا ہے وہیں مرثیوں میں اخلاقی مضامین اور بلندیاں اس طرح سامنے آتی ہیں کہ رہتی دنیا تک وہ کسی بھی مہذب سماج کے لیے مشعل راہ ہوسکتی ہیں۔ یہ اخلاقیات ایک طرف تو شاعر کے بیان سے ظاہر ہوتی ہے مثلاً میر انیس لکھتے ہیں:

نیک و بد عالم میں تامل نہیں کرتے | عارف کبھی اتنا بھی تجاہل نہیں کرتے
خاروں کے لیے رخ طرف گل نہیں کرتے | تعریف خوش الحانی بلبل نہیں کرتے
خاموش ہیں گو شیشۂ دل چور ہوئے ہیں
اشکوں کے ٹپک پڑنے سے مجبور ہوئے ہیں

کہیں کہیں براہ راست اخلاقیات کا بیان ہے۔ اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل مرثیے جن کے مطلعے یہ ہیں:

ع .... جب خاتمہ بخیر ہوا، فوج شاہ کا
ع .... جب زلف کو کھولے ہوئے لیلائے شب آئی
ع .... جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے

دیکھے جاسکتے ہیں۔ خصوصیت سے ایک بند، امام عالی مقام کے رجز سے پیش کیا جاتا ہے:

خوشبو کا اپنی گل نے کیا ہے کبھی بیاں | شیریں لبوں میں شکر کبھی ہوتی ہے عیاں
کھلتی ہے آپ مشک کی بو وقت امتحاں | کتنا جھکا ہے اتنی بلندی سے آسماں
سایہ بڑا ہے تجھ سے بگولا دراز ہے
البتہ خاکسار جو ہے سرفراز ہے

Scanned with CamScanner

10.6 مرثیۂ انیس
10.7 مرثیے کا تجزیہ
10.8 ایک بند کی تشریح
10.9 خلاصہ
10.10 نمونہ امتحانی سوالات
10.11 فرہنگ
10.12 سفارش کردہ کتابیں

10.1 تمہید

اردو مرثیہ اپنی عظمت انسانی، اعلیٰ اخلاقی اقدار اور اس قربانی کی بدولت پہچانا جاتا ہے جس کی نظیر انسانی تاریخ، آج تک نہیں پیش کرسکی۔ ابتدا میں یہ واقعہ صرف تاریخ کا ایک سانحہ تھا لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا لوگوں کو اس واقعے کی عظمت اور اہمیت کا احساس ہونے لگا۔ خصوصاً اس لیے کہ یہ قربانی انسانیت کی فلاح اور اسلام کی بقا کے لیے دی گئی تھی۔ 'بنی امیہ' کے دورِ حکومت میں اس واقعے کو دبا دیا گیا تھا لیکن ایران میں ہر سال اس واقعے کی بازگشت سنائی دیتی رہی۔ دھیرے دھیرے اس واقعے کو تشہیر ملی اور مشرقِ وسطیٰ کے ممالک میں پھیلنے لگا۔ واقعہ کی ہمہ گیری اور آفاقیت نے اسے ملک کی سرحدوں سے نکال کر پوری دنیا کے انسانوں میں امن کے پیغام کی حیثیت سے پہنچایا۔ تاکہ لوگ ظلم اور استبداد کے خلاف متحد ہوکر مقابلہ کریں اور سماجی برابری اور انسانی مساوات کو دنیا میں عام کریں۔

مرثیے کی ابتدا ذاتی، شخصی اور تاثراتی نظموں سے ہوئی؛ جس میں مرنے والے کے اوصاف بیان کیے جاتے تھے۔ لیکن آج مرثیے سے مراد وہ خاص واقعہ ہے جو ڈیڑھ ہزار سال پہلے عرب میں پیش آیا۔ عرب سے یہ شاعری ایران پہنچی تو صفوی بادشاہوں کے زمانے میں مرثیہ گوئی کا آغاز ہوا۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ مرثیے کا فن سب سے زیادہ اردو میں پھولا پھلا اور عزاداری کے رواج نے اس واقعہ کو تمام دنیا میں پھیلایا۔ تقریباً 100 سال سے کچھ زیادہ کا عرصہ، مرثیے کا زرین دور ہے۔ لیکن انیس اور دبیر جیسا مرثیہ گو نہ تو ان سے قبل پیدا ہوا تھا اور نہ ان کے بعد کوئی مثال دی جاسکتی ہے۔ یہ انہیں کی محنت اور ریاضت کا نتیجہ ہے کہ مرثیے آج بھی مقبول ہیں۔

10.2 عہد (ا)

میر انیس کا دور 1803ء سے 1872ء تک محیط ہے۔ 18ویں صدی عیسوی کی ابتدا میں برہان الملک سعادت خان اودھ کے صوبے دار مقرر ہوئے اور یہاں انہوں نے ہند ایرانی تہذیب کے وہ نمونے پیش کیے جن کی بنا پر لکھنؤ کی رواداری آج بھی ضرب المثل ہے۔ محرم کے ساتھ ساتھ ہولی، بسنت اور دیوالی بھی منائی جاتی تھی۔ وہ ائمہ اور معصومین سے بڑی محبت رکھتے تھے۔ اسی دور سے لکھنؤ میں امام باڑے بننا شروع ہوگئے تھے جہاں لوگ اجتماعی طور پر مراسمِ عزا بجالاتے تھے۔ کسی کام کی بنا پڑ جائے تو اسے ترقی دینے میں زیادہ وقت نہیں لگتا۔ سعادت علی خاں کے بعد کے فرمانرواؤں نے اسے خوب ترقی دی۔ چونکہ نوابین اودھ شیعہ تھے اس لیے انہوں نے عزاداری کو بہت فروغ دیا۔ آصف الدولہ کے امام باڑے کو ساری دنیا میں فنِ تعمیر کی بے نظیر عمارت ہونے کا شرف حاصل ہے۔ لکھنؤ کے فرمانرواؤں نے عزاداری میں کئی طرح کی جدتیں پیدا کیں؛ جن کا تعلق ہندستانی تہذیب سے زیادہ ہے۔ امام باڑوں کی تعمیر، ان کی آرائش وزیبائش، 'نشان' تابوت' ضریح' تعزیے اور ان کے متعلقات پر خوب توجہ ہوئی۔

سلیقہ اور نفاست تو لکھنؤ والوں کے مزاج میں تھی ہی؛ اسی احساس حسن نے لکھنؤ میں اصلاحِ زبان کی پوری تحریک چلا دی۔ یہ آتش اور ناسخ کے دور کا لکھنؤ تھا۔ زبان کے ایک ایک نکتے پر بحث مباحثے ہوتے تھے۔ رات رات بھر داستانیں پڑھی جاتی تھیں۔ کئی کئی دن مثنوی خوانی کا دور چلتا اور مرثیے تو یہاں کی تہذیب میں رچ بس گئے تھے۔ ادب اور فنون لطیفہ کے میدان سب کے لیے کھلے تھے۔ اس دور میں

Scanned with CamScanner

لکھنؤ کے ادب وفنون نے جو ترقی کی۔ وہ نہ اس سے پہلے کبھی کی تھی اور نہ بعد میں ہوسکی۔ اصلاح زبان کی تحریک نے ادب کی تمام اصناف میں بہترین نمونے پیدا کیے۔ داستانوں میں طلسم ہوش ربا اور فسانہ عجائب کے مقام و مرتبے سے روپوشی نہیں کی جاسکتی۔ اردو کی تین بہترین مثنویاں سحرالبیان، گلزار نسیم اور زہر عشق تقریباً ساٹھ برس کے عرصے میں اسی سرزمین پر لکھی گئیں۔ آتش اور ناسخ نے اردو شاعری کو حسن زبان اور حسن خیال دونوں سے نوازا۔ لیکن مرثیہ ان سب پر بازی مار لے گیا کیوں کہ اس کے ساتھ مذہبی عقائد اور ایک حقیقی واقعہ وابستہ تھا۔

مرثیے کی مقبولیت کا ایک اور سبب یہ تھا کہ اودھ کی حکومت دھیرے دھیرے انگریزوں کے ہاتھ میں جارہی تھی۔ وہ آصف الدولہ کے دور سے ہی بہانے بنا کر دولت پر قبضہ جمارہے تھے۔ انگریزوں کا دباؤ، مرکزی حکومت کی بیخ کنی، چھوٹی ریاستوں کا خاتمہ، جنگ آزادی کی جدوجہد، ایسے حالات تھے جن سے فرار کے دو ہی راستے تھے۔ یا تو حالات زمانہ کو بھول کر بادہ و ساغر اور تفنن کے راستے تلاش کیے جائیں یا پھر وقت اور حالات سے لڑنے کے لیے روحانیت اور مذہب کے دامن میں پناہ لی جائے۔ مرثیوں کے ہیرو جو خود انہیں حالات سے نبرد آزما تھے، ایسے حالات میں مثالی پیکر بن کر انہیں تقویت دیتے تھے اور یہ مرثیوں کی مقبولیت کا ایک بڑا سبب تھا۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. میر انیس کے عہد میں عزاداری کو فروغ ملنے کے کیا سباب تھے؟
2. میر انیس کے عہد میں کون کونسی مثنویاں لکھی گئیں؟

10.3 حیات

انیس کا تعلق ایک نہایت نستعلیق، مہذب اور تعلیم یافتہ گھرانے سے تھا۔ ان کے پردادا میر ضاحک دلی سے تعلق رکھتے تھے اور اچھے شاعر تھے۔ انہوں نے شاعری کی جملہ اصناف میں طبع آزمائی کی۔ ان کی بیٹے میر حسن اپنی معرکۃ الآرا مثنوی سحرالبیان کے سبب مشہور ہوئے۔ ان کے بیٹے میر خلیق نے مرثیہ گوئی میں خصوصاً بڑا نام پیدا کیا۔ خلیق نے فیض آباد میں سکونت اختیار کی اور یہیں 1803ء میں وہ بچہ پیدا ہوا جس کا مرثیہ گوئی میں آج تک جواب نہ مل سکا۔ میر خلیق کے دو بیٹے اور تھے۔ میر مہر علی اُنس اور میر نواب مونس۔ یہ بھی شاعر تھے لیکن میر انیس کے مقام و مرتبے تک کوئی نہیں پہنچ سکا۔ ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت ماں کی آغوش میں ہوئی جو خود ایک تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ سترہ سال کی عمر میں وہ خلیق کے ساتھ لکھنؤ آگئے اور تعلیم کے اعلا مدارج طے کیے۔ فارسی اور عربی بہت اچھی جانتے تھے۔ قرآن و حدیث، منطق و فلسفہ، فنونِ سپہ گری وغیرہ پر غیر معمولی قدرت رکھتے تھے جس کا اظہار ان کے مرثیوں میں جابجا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ علم نجوم، طب، رمل، تاریخ اسلام اور جغرافیہ وغیرہ کا خاصہ علم تھا۔ زبان و بیان کے ساتھ ساتھ ان علوم نے بھی ان کے مرثیوں کو اعلیٰ تخلیقی ادب کا درجہ دیا۔ ظاہر ہے کہ ایسی باکمال شخصیت اعلیٰ اخلاقی قدروں کی مالک تھی۔ انیس حسن سیرت اور حسن صورت کا مجموعہ تھے۔

تعلیم و تربیت نے انہیں سخت کوش، مہذب اور وقت کا پابند بنادیا تھا۔ مزاجاً وہ نہایت متین، سنجیدہ، خوددار اور مہذب انسان تھے۔ شخصیت کی ان خوبیوں کا اثر ان کے کردار پر بھی پڑا۔ وہ نہایت پاکیزہ خیال، متقی، پرہیزگار اور وضعدار انسان تھے۔

وہ اپنے اصول اور وضعداری کے پابند تھے اور حتی الامکان اُسے نباہنے کی کوشش کرتے تھے۔ لکھنؤ سے باہر جاکر مجلس پڑھنا انہیں قطعی پسند نہ تھا۔ بہت سے امرا، رؤسا اور جاگیرداروں نے خواہش کی کہ انیس ان کے یہاں مجلس پڑھیں۔ لیکن انہوں نے صاف انکار کردیا۔ لیکن انتزاع سلطنت کے بعد مجبوری حالات نے انہیں نہ صرف پٹنہ، الہٰ آباد و لکھنؤ کے سفر کرائے بلکہ نواب تہور جنگ کے بے حد اصرار پر حیدرآباد کا سفر بھی کیا۔ لیکن جھک کر اور دب کر کہیں جانا منظور نہ کیا۔ یہ سفر انہوں نے 1858ء اور 1859ء میں کیے جب وہ پچپن سال کی ادھیڑ عمر کو پہنچ گئے تھے۔ قناعت اور توکل ان میں حد درجہ تھا۔ خدا کے سوا انہوں نے کبھی کسی کے سامنے دست سوال دراز نہیں کیا۔

انیس کی مرثیہ گوئی کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ہندوستانی اور سیکولر عناصر کو اپنے کلام میں جگہ دی اور اس نے عام انسانوں کو مرثیے کی طرف آنے کی دعوت دی۔ انہوں نے اس لکھنوی تہذیب کو اپنے مرثیوں میں محفوظ کردیا۔ جس کا چرچا آج بھی لوگ فخریہ انداز میں کرتے ہیں۔ یہ مرثیے شرافت کے اعلیٰ ترین معیار کا نمونہ ہیں۔

Scanned with CamScanner

10.3.1 انیس کی مرثیہ خوانی

لکھنؤ میں داستان گوئی، مثنوی خوانی اور مشاعروں کا رواج عام تھا۔ اس کے پڑھنے والے الفاظ کی ادائیگی، آواز کے اتار چڑھاؤ اور اپنے حرکات وسکنات سے ایسا سماں باندھتے ہیں کہ مجمع مسحور ہوجاتا تھا اور یہ سلسلہ رات بھر جاری رہتا۔ مرثیے کا شمار بھی ان اصناف میں ہوتا ہے جس میں ڈرامائی عناصر کی کثرت ہے۔ ایک طویل مرثیہ پڑھنے کے لیے زبان و بیان کے ساتھ ساتھ حرکات وسکنات سے کام لینا بھی ضروری ہے۔ انیس اپنے دور کے سب سے مقبول مرثیہ خواں تھے جو مرثیہ گوئی کے ساتھ ساتھ مجمع کی نفسیات سے بھی خوب واقفیت رکھتے تھے۔

ان کی مرثیہ خوانی کے بارے میں بڑے بڑے شعرا اور ادبا اس باب میں ہم خیال ہیں کہ انہوں نے انیس جیسا ماہر فن مرثیہ خواں کبھی نہیں دیکھا۔ وہ لفظوں سے زمین، آسمان، صحرا، فرات، حملہ، دفاع وغیرہ کی ایسی تصویریں کھینچتے تھے کہ مجمع مسحر ومبہوت ہوجاتا تھا اور وہ ساری چیزیں اس کی نگاہوں کے سامنے تصویر بن کر کھڑی ہوجاتی تھیں۔ رزم خوانی پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ ایسا سماں باندھتے تھے کہ مجمع کھڑا ہوجاتا تھا۔

مرثیہ خواں کے لیے ضروری ہے کہ وہ مرثیہ خوانی میں آواز، لہجہ، ادائے الفاظ، چشم وابرو کے اشارے اور آواز کے نشیب وفراز پر قابو رکھے اور انہیں برموقع برمحل استعمال کرے۔ میر انیس مرثیہ خوانی کے ان آداب سے خوب واقف تھے۔

10.3.2 وفات

19 شوال 1291ھ م 10 دسمبر 1874ء کو لکھنؤ میں ان کا انتقال ہوا۔ تقریباً ایک ماہ بیمار رہے۔ اپنے باغ واقع چوبداری محلہ میں دفن ہوئے۔ انتقال کے وقت ان کی عمر قمری حساب سے 73 سال چند مہینے اور شمسی حساب سے 71 برس کی تھی۔ ان کی مجلس مرزا دبیر نے میر باقر کے امام باڑے میں پڑھی اور ایک بے مثل مسدس اور تاریخ وفات لکھی جس کا تیسرا شعر زبان زد ہر خاص و عام ہے:

آسماں بے ماہ کامل، سدرہ بے روح الامیں
طور سینا بے کلیم اللہ، و منبر بے انیس

لوگوں نے انیس و دبیر کو لڑانے اور ان میں غلط فہمیاں پھیلانے کی بڑی کوشش کی لیکن کبھی ان دونوں کے دلوں میں میل نہیں آیا۔ بلکہ یہ دونوں صاحبان علم وفن ایک دوسرے کے مداح تھے۔ انیس کی جدائی میں دبیر بستر سے لگ گئے اور تقریباً تین ماہ بعد دبیر نے بھی انتقال کیا۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. انیس کے خاندانی حالات بیان کیجیے۔
2. انیس کی علمی استطاعت کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟
3. انیس کی مرثیہ خوانی پر اظہار خیال کیجیے۔
4. کس سنہ میں انیس کا انتقال ہوا؟ (1) 1874 (2) 1757 (3) 1857

10.4 انیس کی مرثیہ نگاری کی خصوصیات (3)

انیس کے مرثیوں میں زبان و بیان کے حیرت انگیز تجربے ملتے ہیں۔ ان میں ان کی قادرالکلامی، فنی تبحر، انسانی نفسیات، اخلاقی اقدار، رزم کے ہنگامے، بزم کی رعنائیاں، کردار نگاری، منظر نگاری، جذبات نگاری، سراپا نگاری، تاریخ، تہذیب، فصاحت و بلاغت کا ہر نقش نظر آتا ہے۔ ان کے مرثیوں میں تقریر و خطابت کی جھلک بھی ہے، مجلس کے ماحول کی پابندیاں بھی ہیں اور سامعین کو تڑپانے والی کیفیت بھی ہے۔ انہوں نے صنائع بدائع سے بھی اپنے کلام کو سنوارا ہے۔ ان کے یہاں موقع ومحل کے لحاظ سے مکالمے بھی ہیں اور الفاظ وتراکیب کا استعمال

بھی ہے اسی لیے انیس کے مرثیوں کو 'معجز بیانی' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہاں ہم ان کے مرثیوں کی چند اہم خصوصیات کے بارے میں گفتگو کریں گے۔

10.4.1 سراپا نگاری

میر انیس نے اپنے مرثیوں میں سراپا نگاری سے اکثر گریز کیا ہے۔ خصوصاً رسول اکرمؐ اور ائمہ اطہار کے سراپے لکھنے میں احتراماً گریز کیا ہے۔ البتہ امامؑ کے جگر گوشوں اور رفقائے حسینی کے سراپے ضرور لکھے ہیں۔ ان میں بھی علی اکبرؑ، حضرت قاسمؑ اور حضرت عباسؑ کے سراپے بڑے جوش و عقیدت سے لکھے ہیں۔ رفقائے حسینی کا مجموعی سراپا دیکھیے:

وہ چاند سے ماتھے، وہ قبائیں، وہ عبائیں
تسبیحیں تو ہاتھوں میں، زبانوں پہ دعائیں
تن پھول سے، غنچوں کی طرح تنگ قبائیں
بس جائے وہ سب راہ، یہ جس راہ سے جائیں
نورِ مہ کامل کبھی سینے کو نہ پہنچے
بو ایسی کہ عطر ان کے پسینے کو نہ پہنچے

10.4.2 کردار نگاری

اردو شاعری میں کردار نگاری یا سیرت نگاری گویا تھی ہی نہیں۔ اس کے کچھ نمونے مثنویوں میں مل جاتے ہیں۔ لیکن وہ اکثر غیر فطری یا مافوق الفطرت عناصر سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ کردار نہ تو تاریخی ہیں اور نہ ان کے ساتھ لوگوں کا جذباتی تعلق ہے۔ یہ کردار ہماری زندگی کے جیتے جاگتے کردار نہیں بلکہ ہماری روزمرہ زندگی سے خاصے دور ہیں۔

مرثیے کے کردار نہ تو مافوق الفطرت عناصر سے تعلق رکھتے ہیں اور نہ فرضی کردار ہیں بلکہ واقعہ جس طرح پیش آیا تھا وہ حقیقی ہونے کے ساتھ ساتھ دردوا اثر بھی رکھتا ہے۔ یہی کیفیت ان کے کرداروں کی بھی ہے، جو عمل اور تاثیر میں بے مثل ہیں۔ انہوں نے دو طرح کے کردار تراشے ہیں جو خیر و شر کے مجسمے ہیں۔ یعنی امام حسینؑ کا مختصر گروہ اور یزیدی فوج کا ہزاروں کا لشکر۔ حسینی جماعت کے افراد مثالی پیکر ہونے کے باوجود فوق البشر خصوصیات کے حامل نہیں بلکہ اپنی تخلیقی قوت سے انہوں نے ایسے کردار پیش کیے ہیں جنہیں ہم تمام انسانوں سے قریب تر سمجھ کر قبول کرتے ہیں۔ سب سے مکمل اور مثالی کردار امام حسینؑ کا ہے، جس پر پورے واقعہ کربلا کا دارومدار ہے۔ یہ کردار انیس نے اپنے تمام مرثیوں میں الگ الگ تحریر کیا ہے۔ لیکن ہر جگہ تاثر ایک سا ہے۔ دوسرے شہدا کے حال کے مرثیوں میں بھی امام حسینؑ کا ذکر لازمی ہے۔ وہ حق پرستی، حق گوئی، کنبہ پروری، اعلیٰ اخلاق، مروت، محبت اور شجاعت کا مثالی پیکر ہیں۔

نماز صبح کے بعد وہ بے خوف ہو کر اپنے ساتھیوں کو جنگ کرنے اور جان دینے کی دعوت دیتے ہیں گویا ان کی تخلیق ہی اسی مقصد کے لیے ہوئی تھی:

ہاں غازیو! یہ دن ہے جدال و قتال کا
یاں خوں بہے گا آج محمدؐ کی آل کا
چہرہ خوشی سے سرخ ہے زہرا کے لال کا
گزری شب فراق، دن آیا وصال کا
ہم وہ ہیں غم کریں گے ملک جن کے واسطے
راتیں تڑپ کے کاٹی ہیں اس دن کے واسطے

حضرت عباس، جو قوت بازو تھے، ان کا کردار حضرت علی کے مماثل لکھا ہے جو شجاعت، ہمت اور مردانگی میں بے مثل تھے۔ حسینی فوج کے علم دار کی حیثیت سے تمام مرثیوں میں ان کا ذکر بڑی تفصیل سے آیا ہے۔ یہاں طوالت کے خوف سے صرف دو بند انیس کے کلام سے نقل

کیے جاتے ہیں:

سرو شرمائے قد' اس طرح کا قامت ایسی　　اسد اللہ کی تصویر تھے صورت ایسی
شیر نعروں سے دہل جاتے تھے صورت ایسی　　جا کے پانی نہ پیا نہر میں ہمت ایسی
جان جب تک تھی اطاعت میں رہے بھائی کی
تھے علم دار مگر بچوں کی سقائی کی

نسوانی کرداروں میں حضرت زینب کا کردار بے مثل ہے۔ رسولؐ کی نواسی' علی کی بیٹی اور امام حسینؑ کی بہن کا کردار پیش کرنا کچھ آسان کام نہ تھا۔ یہ وہ بہن تھی جس نے اپنے زور خطابت سے واقعہ کربلا کا رخ موڑ دیا اور شہادت حسین کو یزید کی ذلت و رسوائی کا سبب بنادیا۔ امام حسین کے ساتھ ہر ہیرو کی شہادت پر حضرت زینبؓ بین کرتی نظر آتی ہیں اور ہر شہادت پر امام حسینؑ بہن کو ڈھارس بندھاتے نظر آتے ہیں۔ لیکن اسی چاہنے والے بھائی کی لاش پر رونے والی صرف چند عورتیں خیمے میں تھیں۔ حضرت زینب بے قرار ہو کر بھائی کی شہادت کی خبر سن کر کھلے سر' برہنہ پا' میدان جنگ کی طرف بھاگتی ہیں:

پردہ الٹ کے بنت علی نکلی ننگے سر　　لرزاں قدم' خمیدہ کمر' غرق خوں' جگر
چاروں طرف پکارتی تھی سر کو پیٹ کر　　اے کربلا بتا! تیرا مہمان ہے کدھر
اماں قدم اب اٹھتے نہیں تشنہ کام کے
پہنچا دو لاش پر' مرے بازو کو تھام کے

10.4.3 جذبات نگاری

واقعہ کربلا ایک المیہ ہے اور درد و غم کے بیان میں جذبات جس طرح کھل کر سامنے آتے ہیں ویسا اور کوئی دوسرا موقع انسان کی زندگی میں نہیں آتا۔ ہر موقع پر انسان اپنے جذبات کو چھپا سکتا ہے لیکن رنج و غم اس کی آنکھوں سے عیاں ہو جاتے ہیں۔ امام حسینؑ کی پوری زندگی درد و غم کا ایک ایسا لامتناہی سلسلہ تھی جسے انہوں نے صرف صبر و رضا کے راستے طے کیا۔ ان کے ساتھ بوڑھے' بچے' عورتیں اور جوان بہتر (72) کی تعداد میں موجود تھے۔ ان سب کے جذبات الگ الگ مگر مقصد حیات صرف ایک ہے یعنی شہادت۔ اس واقعے میں غم' غصہ' خوشی' محبت' نفرت' تاسف' شرمندگی وغیرہ سیکڑوں طرح کے جذبات ہیں لیکن انیس کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ہر موقع پر جذبات کی عکاسی بڑے سلیقے سے کی ہے اور کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ ان جذبات کا اظہار پورا نہیں ہوا' یوں کہا ہوتا تو زیادہ بہتر ہوتا۔ انسانی فطرت پر ان کی بے مثل گرفت تھی۔ وہ صرف شہیدوں کی لاش پر گریہ کرنے کو جذبات نگاری نہیں سمجھتے بلکہ انسانوں کے ہر عمل میں جذبات کے نمونے دیکھتے اور پیش کرتے ہیں۔ حضرت زینبؓ نہایت جری خاتون ہونے کے باوجود اپنے بھائی کو آفت میں گرفتار نہیں دیکھ سکتیں اور ان کے الفاظ دعا بن کر پھوٹ پڑتے ہیں:-

سر پر نہ اب علی' نہ رسول فلک وقار　　گھر لٹ گیا' گزر گئیں خاتونِ روزگار
اماں کے بعد روئی حسن کو میں سوگوار　　دنیا میں اب حسین ہے ان سب کی یادگار
تو داد دے مری کہ عدالت پناہ ہے
کچھ اس پہ بن گئی' تو یہ مجمع تباہ ہے

مدینے سے رخصت کے وقت حضرت ام البنین (حضرت عباس کی والدہ) اور حضرت فاطمہ صغراؓ امام حسین کے ساتھ کربلا نہ آسکی

تھیں۔ رخصت کے وقت ایسے الم ناک الفاظ منہ سے نکالتی ہیں:

سب بیبیاں رونے لگیں سن سن کے یہ تقریر — چھاتی سے لگا کے اسے کہنے لگے شبیر
لو صبر کرد کوچ میں اب ہوتی ہے تاخیر — منہ دیکھ کے چپ رہ گئی وہ بے کس و دلگیر

نزدیک تھا دل چیر کے پہلو نکل آئے
'اچھا' تو کہا منہ سے، پہ آنسو نکل آئے

جذبات کے اصلی منظر بین میں دکھائی دیتے ہیں۔ حضرت قاسم فاطمہ کبریٰ سے شادی کے فوراً بعد میدان جنگ کو سدھارتے ہیں۔ ایک شب کی دلھن شرم کے مارے اپنے جذبات کا اظہار نہیں کر سکتی۔ انیس نے بڑی خوبصورتی سے اس واقعہ کو پیش کر دیا ہے۔ جو بڑا فطری سا لگتا ہے۔

یا رب دلہن بنے مجھے گزری ہے ایک شب — دولھا جو مرگیا تو مجھے کیا کہیں گے سب
اب تک تو شرم سے نہ ہلائے تھے میں نے لب — پر کیا کروں کہ اب ہے میری روح پر تعب

شبیر کے آفتاب کا وقت غروب ہے
دولہا سے پہلے مجھ کو اٹھالے تو خوب ہے

10.4.4 منظر نگاری (7)

اردو میں منظر نگاری کے کچھ نمونے مثنویوں تک محدود ہیں۔ اردو میں مرثیہ وہ واحد صنف ہے جس میں منظر نگاری کے اعلیٰ ترین نمونے پیش کیے گئے ہیں۔ کربلا کے بے آب وگیاہ میدان میں پیڑ، پودے اور جنگل وغیرہ کا ذکر بے معنی ہے لیکن چہرے یا تمہید کے بندوں میں انیس نے خوب خوب کمالات دکھائے ہیں۔ جنگ کے وقت منظر کا بیان تو سورج کی تمازت، ریت کی تپش اور لو، دھوپ کے تھپیڑوں تک محدود ہے، لیکن اس محدود منظر میں بھی انیس نے ایسی ایسی گل کاریاں کی ہیں کہ موسم بہار کے مناظر بھی پھیکے پڑ جائیں۔

وہ لو، وہ آفتاب کی حدت، وہ تاب وتب — کالا تھا رنگ دھوپ سے دن کا مثالِ شب
خود نہر علقمہ کے بھی سوکھے ہوئے تھے لب — خیمے جو تھے حبابوں کے، تپتے تھے سب کے سب

اڑتی تھی خاک، خشک تھا چشمہ حیات کا
کھولا ہوا تھا دھوپ سے پانی، فرات کا

اسی مرثیے کے چہرے میں نہایت خوبصورت اور ٹھنڈی صبح کا منظر پیش کیا ہے۔

وہ صبح اور وہ چھاؤں ستاروں کی اور وہ نور — دیکھے تو غش کرے ارنی گوئے اوج طور
پیدا گلوں سے قدرت اللہ کا ظہور — وہ جا بجا درختوں پہ تسبیح خواں طیور

گلشن خجل تھے وادیِ مینو اساس سے
جنگل تھا سب بسا ہوا پھولوں کے باس سے

Scanned with CamScanner

وہ دشت وہ نسیم کے جھونکے وہ سبزہ زار
پھولوں پہ جابجا وہ گہر ہائے آبدار
اٹھنا وہ جھوم جھوم کے شاخوں کا بار بار
بالائے نخل ایک جو بلبل تو گل ہزار
خواہاں تھے نخلِ گلشنِ زہرا جو آب کے
شبنم نے بھر دیے تھے کٹورے گلاب کے

ٹھنڈی ٹھنڈی وہ ہوائیں' وہ بیاباں' وہ سحر
دم بدم جھومتے تھے وجد کے عالم میں شجر
اوس نے فرش زمرد پہ بچھائے تھے گہر
لوٹی جاتی تھی لہکتے ہوئے سبزے پہ نظر
دشت سے جھوم کے جب بادِ صبا آئی تھی
صاف غنچوں کے چٹکنے کی صدا آئی تھی

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

10.4.5 واقعہ نگاری

کسی واقعے کو تسلسل کے ساتھ تحریر کرنا بذاتِ خود ایک فن ہے۔ واقعہ نگاری میں جذبات کی شمولیت ضروری ہے۔ واقعہ صرف ایک منظر نہیں جسے سپاٹ اور سادہ لفظوں میں پیش کردیا جائے بلکہ اس واقعہ کی جزئیات کی تفصیل بیان کرنا ہی واقعہ کو پر اثر بنا دیتا ہے۔ اصل واقعہ میں شاعر اپنے مشاہدے اور تخیل سے ایسی رنگ آمیزی کرتا ہے گویا وہ جائے وقوع پر خود موجود تھا۔ انیس نے جہاں جہاں واقعہ نگاری کی ہے وہاں گویا چلتی پھرتی تصویریں پیش کردی ہیں۔

حضرت عباس کو علم داری سونپنے کا موقع ہے۔ حضرت عون و محمد علم داری کی خواہش رکھتے ہیں لیکن کمسن ہونے کے سبب وہ کھل کر اس خواہش کا اظہار نہیں کرسکتے بلکہ ماں کے سامنے اشاروں میں اپنی خواہش کا اظہار کرتے ہیں۔

گہ ماں کو دیکھتے تھے کبھی جانبِ علم
نعرہ کبھی یہ تھا کہ نثارِ شہہ اُمم
کرتے تھے دونوں بھائی کبھی مشورے بہم
آہستہ پوچھتے کبھی ماں سے وہ ذی حشم
کیا قصد ہے علیِ ولی کے نشان کا؟
اماں! کسے ملے گا علم نانا جان کا

حضرت زینب ان کا اشارہ سمجھ کر گھبرا جاتی ہیں اور بچوں کو تنبیہ کرتی ہیں کہ اپنی عمر اور حوصلے سے زیادہ خواہش رکھنا مناسب نہیں۔ اس موقع کو انیس نے بڑی خوبصورتی سے نظم کیا ہے جو واقعہ نگاری کے ساتھ ساتھ انسانی نفسیات کا بہترین مرقع ہے۔

عمریں قلیل اور ہوس منصب جلیل
اچھا نکالو قد کے بھی بڑھنے کی کچھ سبیل
ماں صدقے جائے گرچہ یہ ہمت کی ہے دلیل
ہاں اپنے ہم سنوں میں تمہارا نہیں عدیل
لازم ہے سوچے' غور کرے' پیش و پس کرے
جو ہو سکے نہ' کیوں بشر اس کی ہوس کرے!

10.4.6 مکالمہ نگاری

مراثی انیس میں مکالمے کی جیسی مثالیں ملتی ہیں اس کی نظیر اردو نظم و نثر کی پوری تاریخ پیش نہیں کرسکتی۔ مکالمہ نگاری کے لیے نہ صرف زبان و بیان پر قدرت ضروری ہے بلکہ روزمرہ اور محاورہ' حفظ مراتب' انسانی نفسیات اور فصاحت و سلاست نہایت ضروری ہے۔ زبان' ترسیل کا ایسا ذریعہ ہے جس پر سارا کاروبار دنیا ٹھہرا ہوا ہے۔ مکالمے ذو معنین' گنجلک اور طویل نہ ہونے چاہئیں۔ انیس نے اپنے کلام میں ان ساری چیزوں کا بڑا اہتمام کیا ہے۔ ان کے مکالموں کی بے ساختگی اور برجستگی ہر جگہ نمایاں ہے۔ سوچ سمجھ کر بولا گیا مکالمہ زبان کے فطری حسن کو ختم کر دیتا ہے۔ مکالمے کردار کے اعمال' افکار اور فطری مزاج کا بھی آئینہ ہوتے ہیں۔ انیس کے لیے یہ کام اور بھی مشکل تھا کیوں کہ ان کے کردار معمولی انسان نہیں تھے۔ ہنسی مذاق' مضحکہ' ابتذال' سازشیں' نفرت جیسے مذموم جذبات کو بھی مرثیے سے الگ رکھنا تھا۔ اس کے باوجود ان کے تمام مکالمے نہایت معیاری اور اعلیٰ ترین اخلاقی قدروں کے نمونے نظر آتے ہیں۔ ان کے مکالموں میں لکھنؤ کی تہذیب کی اثر اندازی بھی صاف نظر آتی ہے۔ حضرت عباس کو فوج کی علم برداری دی گئی تو ان کی زوجہ' حضرت زینب (حضرت عباس کی بڑی بہن) کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فرماتی ہیں۔

فیض آپ کا ہے اور تصدق امام کا — عزت بڑھی کنیز کی' رتبہ غلام کا

جواب میں حضرت زینب فرماتی ہیں:

سر کو لگا کے چھاتی سے زینب نے یہ کہا — تو اپنی مانگ کوکھ سے ٹھنڈی رہے صدا

مکالموں کی سادگی اور لکھنوی تہذیب نے ان مکالموں کو تاثیر میں حد درجہ بڑھا دیا ہے۔ حضرت زینب فوج کی علم برداری ملنے کے بعد اپنے چھوٹے بھائی حضرت عباسؑ سے فرماتی ہیں:

ہو جائے آج صلح کی صورت' تو کل چلو — ان آفتوں سے بھائی کو لے کر نکل چلو

اسی موقع پر زوجۂ عباس کو دعا دیتے ہوئے فرماتی ہیں۔

مہندی تمہارا لال ملے ہاتھ پاؤں میں — لاؤ دلہن کو بیاہ کے تاروں کی چھاؤں میں

یہاں بھی زبان کی سادگی کے ساتھ ساتھ لکھنوی تہذیب نمایاں ہے۔

کہیں کرداروں کی زبان دو طرح کی ہے۔ یعنی ایک وہ جو گھر میں اعزا اور خردوں و بزرگوں کے ساتھ بولتے تھے۔ دوسری وہ جو لکھنؤ کے شرفا گھر سے باہر بولتے تھے۔ انیس نے حسینی افواج کے کرداروں میں ان موقعوں کا لحاظ رکھا ہے۔ جہاں کہیں حفظ مراتب کا معاملہ درپیش ہو وہاں تخاطب مرتبے کے لحاظ سے ہے' ورنہ عام طور پر رشتے کے نام سے تخاطب کیا گیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ حضرت زینب فرماتی ہیں۔

قرآں کے بعد ہے بھی تو ہے آپ کا کلام — گر مجھ سے پوچھتے ہیں شبہ آسماں مقام

اپنے بچوں کو تنبیہ کرتی ہیں۔

زینب نے تب کہا کہ تمہیں اس سے کیا ہے کام! — کیا دخل مجھ کو' مالک و مختار ہیں امام

بچے ماں سے کہتے ہیں

ع غصے کو آپ تھام لیں اے خواہر امام

ع نرغے میں تین دن سے ہے مشکل کشا کا لال

بولیں بہن کہ آپ بھی بولیں کسی کا نام — ہے کس طرف توجہ سرکار خاص و عام

حضرت عباس فوج کی سپہ سالاری ملنے پر شکریہ ادا کرتے ہیں تو حضرت زینب فرماتی ہیں۔

(Turn over)

Scanned with CamScanner

M.A. Semister II
اردو مرثیہ
Cour - CC.4
(1) اردو مرثیہ نگاری کی ابتدا کس صدی میں ہوئی تھی؟
(الف) سولہویں (ب) پندرہویں (ج) اٹھارہویں (د)

ع عباس! فاطمہ کی کمائی سے ہوشیار

لیکن یہی بہن جب بھائی کو جنگ کے لیے رخصت کرتی ہے تو وہاں صرف ایک بھائی کھڑا ہوتا ہے اور تمام مقام و مرتبے بھول کر وہ ایک جان چھڑکنے والی بہن بن جاتی ہیں۔ بھائی کی لاش کو دیکھ کر تڑپ اٹھتی ہے:

ع بھیا! میں اب کہاں سے تمہیں لاؤں کیا کروں

ع بھیا! بتاؤ، کیا تہ خنجر گزر گئی

ڈھانپ کر ہاتھوں سے منہ بنت علی چلائی
ذبح ہوتے ہو مرے سامنے ہے ہے بھائی

یہ صرف دو تین رشتوں کی مثالیں تھیں ورنہ کلام انیس سے ایسی ہزاروں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ میدان جنگ میں دشمن کے سپاہی امام حسینؑ پر طنز کرتے ہیں ع

مرنے والے نہیں جیتے جو سنائیں کھائیں

10.4.7 رزم نگاری (10)

رزمیہ لکھنے میں انیس کو بے پناہ مہارت حاصل تھی۔ اردو شاعری پر ایک بہت بڑا اعتراض تھا کہ عشق و محبت، ہجر و وصال، شمع و پروانہ، گل و بلبل کے تذکروں کے سوا کچھ نہیں۔ اردو شاعری کا مرد، محبوب کی جدائی میں صرف روتا رہتا ہے جو انسانی فطرت کے خلاف تھا۔ حوصلہ، ہمت، بہادری، شجاعت، استقلال، جوانمردی جیسے جذبات اردو شاعری سے تقریباً مفقود تھے۔ قصیدے میں کہیں کہیں ممدوح کی تعریف میں اختصار کے ساتھ جنگ، گھوڑے اور تلوار کا ذکر ملتا ہے لیکن نہایت مبالغے کے ساتھ۔ مرثیے پر یہ الزام غلط ہے کہ وہ صرف بین و بکا کے لیے لکھے جاتے تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ مرثیہ نگاری کا مقصد مرنے والے کی تعریف اور شہادت پر رونا تھا، لیکن جب مرثیہ ایک صنف کی حیثیت سے لکھا جانے لگا تو اس میں دوسرے بہت سے اجزا کی شمولیت نے اسے باوقار بنایا۔ طول و طویل مرثیوں میں اگر چند بند شہادت اور بین کے تصنیف کیے جائیں تو یہ الزام غلط ثابت ہوتا ہے۔ مرثیہ ہی وہ صنف ہے جس میں سب سے پہلے جنگ کا ذکر ہمت و شجاعت اور جوانمردی کے کارنامے ملتے ہیں۔

انیس کے متعلق مشہور ہے کہ ان کے گھر کا ایک وسیع کمرہ رزم نگاری کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ یہاں دیواروں پر مختلف قسم کے ہتھیار لگے رہتے تھے۔ جن کے استعمال اور حملہ و دفاع کی باریکیوں سے انیس واقف تھے۔ اور جس وقت وہ رزمیہ اشعار لکھتے تھے ان پر ایک کیفیت طاری ہوتی تھی اور وہ خود کو کمرے میں بند کر لیتے تھے۔ اس وقت کسی کی مجال نہ تھی کہ وہ دروازے پر دستک دے یا ان سے بات کرے۔ انہوں نے اردو شاعری کو رزمیہ عناصر سے مالا مال کر دیا۔ کوئی مرثیہ اٹھا کر دیکھ لیجیے، اس میں سب سے تفصیلی بیان رزم کا ہے۔ وہ خود دعویٰ کرتے ہیں۔

رزم ایسی ہو کہ دل سب کے پھڑک جائیں ابھی
بجلیاں تیغوں کی آنکھوں میں چمک جائیں ابھی

ظاہر ہے مرثیہ نگاری سے ان کا مقصد صرف رونا رلانا نہیں تھا بلکہ حق کی طرف لوگوں کو دعوت دینا تھا کہ امام حسین نے جس صبر و استقامت کے ساتھ ظلم، شر اور بدی کا مقابلہ کیا اس سے لڑنے کے لیے انسانوں میں جہاد کا جذبہ پیدا کیا جائے۔ اور وہ اس مقصد میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے۔ جنگ کی ایسی باریکیوں کا ذکر دبیر کے سوا کسی دوسرے مرثیہ نگار کے یہاں نہیں ملتا۔ لیکن انیس اس معاملے میں بے مثل ہیں فرماتے ہیں:

طاقت اگر دکھا دوں رسالت مآبؐ کی   رکھ دوں زمین پہ چیر کے ڈھال آفتاب کی

حضرت عون و محمد جو آٹھ نو برس کے بچے تھے ان کی جنگ کا بیان دیکھیے۔

وہ چھوٹے چھوٹے ہاتھ وہ گوری کلائیاں
آفت کی پھرتیاں تھیں غضب کی صفائیاں

ڈر ڈر کے کاٹتے تھے کماں کش کنائیاں
فوجوں میں تھیں نبیؐ و علیؑ کی دہائیاں

امام حسین دشمن کو للکارتے ہیں:

لو! سیل کو اور برق شرر بار کو روکو
رہوار کو روکو، مری تلوار کو روکو!

....

پانی ہوئی ہر موج زرہ فوج کے تن میں
ملبوس میں زندہ تھے کہ مردے تھے کفن میں

اپنی معلومات کی جانچ

1. انیس کے مرثیوں کی خصوصیات بیان کیجیے۔
2. انیس کی کردار نگاری پر مختصر نوٹ لکھیے۔
3. انیس کی جذبات نگاری پر تبصرہ کیجیے۔
4. رزم نگاری سے کیا مراد ہے؟

10.5 اُسلوبی خصوصیات (II)

زبان و بیان کے لحاظ سے اس مرثیے کا شمار انیس کے منتخب مرثیوں میں ہوتا ہے۔ اعلیٰ درجے کی شاعری کے جو شرائط ہیں وہ کلام انیس
میں کسی بھی مقام پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ چیزوں کے علم، زبان پر قدرت اور اظہار کے اعلیٰ پیمانوں پر یہ مرثیے پورے اترتے ہیں۔ اگر ان میں
سے ایک بھی پہلو کمزور رہ جائے تو قوت بیان میں کمی آجاتی ہے۔ ان کی قادر الکلامی میں کوئی کلام نہیں۔ قادر الکلامی کا اعلیٰ منصب یہ ہے کہ
شاعر سامعین کو اپنے قبضے میں کرلے اور وہ جذبات یا خیالات جو شاعر سامعین کے دل میں پیدا کرنا چاہتا ہے، مجمع اسے قبول کرلے۔ یہاں ان
کی لسانی خصوصیات کا مختصر جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

10.5.1 فصاحت و بلاغت

فصاحت کے متعلق خود میر انیس کا خیال یہ ہے کہ

داند آں کس کہ فصاحت بے کلامے دارد
ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد

انہوں نے خود پوری شاعری میں اس کی پابندی کی۔ وہ فصیح سے فصیح تر لفظ ڈھونڈ کرلاتے ہیں اور واقعہ کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ
اس کا اثر کئی گنا بڑھ جاتا ہے۔ واقعہ کربلا ایک ہی ہے اور شہدا کی شہادت کا بیان بھی ایک ہی ہے لیکن انیس اسی واقعہ کو ہر بار اس طرح پیش
کرتے ہیں کہ وہ واقعہ نیا معلوم ہونے لگتا ہے۔ ڈیڑھ دو سو بند کے مراثی میں نہ خیال دہرائے جاتے ہیں نہ الفاظ۔

مرثیوں کی نوعیت عوامی اور مجلسی اہمیت کی ہوتی ہے۔ اہل مجلس کو متاثر کرنے، جذبات کو بیدار کرنے کے لیے مرثیوں کی بڑی اہمیت
ہوتی ہے مگر میر انیس نے اسے ایک فن بنادیا۔ ایسا فن جس کی بلندیوں تک آج بھی کوئی نہ پہنچ سکا۔ میر انیس کو اپنی فصاحت کا خود بھی بڑا
احساس تھا۔ اپنے مرثیوں میں جگہ جگہ انہوں نے اس کا ذکر کیا ہے۔

ع نمکِ خوانِ تکلم ہے فصاحت میری

Scanned with CamScanner

M.A. Semester ... اردو مرثیہ

Cour 1 CC 4

(1) اردو مرثیہ نگاری کی ابتدا کس صدی میں ہوئی تھی؟
(الف) سولہویں صدی (ب) پندرہویں صدی (ج) اٹھارہویں صدی (د) ...
(2) ... اردو کا پہلا مرثیہ نگار ... کسے کہا جاتا ہے

ع ہے گوہرِ محیطِ فصاحت سخن مرا

ع پھولا ہوا فصاحتِ الفاظ کا چمن

فصاحت کے علاوہ بلاغت سے بھی میر انیس نے کام لیا ہے۔ فصاحت کی طرح اپنے کلام کی بلاغت پر بھی انھوں نے ناز کیا ہے۔

ناطقے بند ہیں سن سن کے بلاغت مری

انیس نے خود دعا کی ہے:

وہ مرقع ہو کہ دیکھیں اسے گر اہلِ شعور
ہر ورق میں کہیں سایہ نظر آئے، کہیں نور
گل ہو، یہ ہے کشش مو قلم طرۂ حور
صاف ہر رنگ سے ہو قدرت صانع کا ظہور

کوئی ناظر جو یہ نایاب نظیریں سمجھے
نقشِ ارژنگ کو، کاواک لکیریں سمجھے

قلم فکر سے کھینچوں جو کسی بزم کا رنگ
شمع تصویر پہ گرنے لگیں آ آ کے پتنگ
صاف حیرت زدہ مانی ہو تو بہزاد ہو دنگ
خوں برستا نظر آئے جو دکھاؤں صف جنگ

رزم ایسی ہو کہ دل سب کے پھڑک جائیں ابھی
بجلیاں تیغوں کی آنکھوں میں چمک جائیں ابھی

روزمرہ شرفا کا ہو، سلاست ہو وہی
لب و لہجہ وہی سارا ہو، متانت ہو وہی
سامعیں جلد سمجھ لیں جسے، صنعت ہو وہی
یعنی موقع ہو جہاں جس کا، عبارت ہو وہی

لفظ بھی چست ہو، مضمون بھی عالی ہوئے
مرثیہ درد کی باتوں سے نہ خالی ہوئے

انیس کے دور کا لکھنؤ، رعایت لفظی اور صنعتوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ صنعتوں کا اتنا زیادہ بوجھ کبھی کبھی کلام کے فطری حسن پر بار ہوتا ہے، کیوں کہ شاعر آورد کا شکار ہو جاتا ہے۔ انیس نے ان صنعتوں سے خوب فائدہ اٹھایا لیکن کلام کی روانی اور فصاحت کہیں متاثر نہیں ہوتی۔ کلام کے حسن میں اضافے کے لیے وہ کجی اور تیرگی سے بھی کام لینا جائز سمجھتے ہیں۔

ہے کجی عیب، مگر حسن ہے ابرو کے لیے
تیرگی بد ہے، مگر نیک ہے گیسو کے لیے
سرمہ زیبا ہے فقط نرگسِ جادو کے لیے
زیب ہے خال سیہ، چہرۂ گل رو کے لیے

10.5.2 ایہام

کلام میں ایسے '' انا جس کے معنی تو دو ہوتے ہیں مگر ان سے مراد صرف ایک معنی ہوتا ہے یعنی بعیدی معنی لیے جاتے ہیں۔ انیس کے کلام میں ایہام کی ... ی پڑی ہیں مثلاً

... مہر کے پرتو سے نہ جائے
اقلیم سخن میری قلم رو سے نہ جائے
رنگ ... ہیں وہ رنگیں ہے، عبارت میری
شور جس کا ہے وہ دریا ہے طبیعت میری

10.5.3 مبالغہ

کسی بات، واقعہ یا تعریف کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنا مبالغہ ہے۔ حد سے بڑھا ہوا مبالغہ غلو ہے اور یہ کلام کا نقص بن جاتا ہے۔ انیس کے دور کی شاعری میں مبالغہ حد سے زیادہ نظر آتا ہے، جہاں اعتدال اور حسن کلام کی سرحد ختم ہو جاتی ہے۔ انیس کے مزاج میں چوں کہ اعتدال تھا اس لیے ان کا مبالغہ بھی خلاف واقعہ نہیں معلوم ہوتا۔

ایک قطرے کو جو دوں بسط تو قلزم کر دوں — بحر مواج فصاحت کو تلاطم کر دوں
ماہ کو مہر کروں، ذروں کو انجم کر دوں — گنگ کو ماہر انداز تکلم کر دوں
درد سر ہوتا ہے، بے رنگ نہ فریاد کریں — بلبلیں مجھ سے گلستاں کا سبق یاد کریں

10.5.4 تعلّی

اپنی اور اپنے کلام کی تعریف کرنا قدیم دور سے شعرا کا شیوہ رہا ہے۔ شاعر کو اپنا کلام سب سے عزیز ہوتا ہے۔ ہر بڑے چھوٹے شاعر نے تعلّی کے سیکڑوں اشعار باندھے ہیں۔ غالب کہتے ہیں:

ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے — کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

میر کہتے ہیں:

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں ایسی نہ سنیے گا — کہتے کسی کو سنیے گا تو دیر تلک سر دھنیے گا

انیس فرماتے ہیں:

مرغان خوش الحانِ چمن بولیں کیا — جل جاتے ہیں سن کے روزمرّہ مرا

انہوں نے تعلّی کے سیکڑوں بند لکھے ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ مبالغہ نہیں معلوم ہوتے۔ انہیں کلام پر ایسی ماہرانہ قدرت حاصل تھی کہ جہاں چاہتے تھے دریا کو کوزے میں سمیٹ دیتے تھے اور جب چاہتے تھے قطرے کو سمندر بنا دیتے تھے۔ طوالت کے خوف سے یہاں صرف ایک بند پیش کیا جاتا ہیں۔

تعریف میں چشمے کو سمندر سے ملا دوں — قطرے کو جو دوں آب تو گوہر سے ملا دوں
ذرّے کی چمک مہر منوّر سے ملا دوں — کانٹوں کو نزاکت میں گلِ تر سے ملا دوں
گلدستۂ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں
اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

10.5.5 تضاد

کلام میں ایسے الفاظ لانا جو ایک دوسرے کی ضد ہوں۔ مثلاً رات اور دن، جھوٹا اور سچا، اچھا اور برا وغیرہ۔ انیس فرماتے ہیں:

ہے کجی عیب مگر حسن ہے ابرو کے لیے — تیرگی بد ہے مگر نیک ہے گیسو کے لیے

10.5.6 تنسیق الصفات

ممدوح کی صفات کا ذکر ترتیب وار کرنا۔ انیس کہتے ہیں:

ع خوش خو، خوش خرام و خوش اندام و خوش لگام

Scanned with CamScanner

M.A. Semister II

اردو مرثیہ

PAGE:
DATE: / /

Cour CC 4

(1) اردو مرثیہ نگاری کی ابتدا کس صدی میں ہوئی تھی؟

(الف) سولہویں (ب) پندرہویں (ج) اٹھارہویں (د)

(2) کسے اردو کا پہلا مرثیہ نگار تسلیم کیا جاتا ہے؟

(ا) وجہی (ب) اشرف بیابانی (ج) [illegible]

(3)

10.5.7 تجنیس ناقص وزائد

کلام میں ایسے لفظ لانا جس میں ایک حرف کم اور زائد ہو۔ انیس کہتے ہیں

پیاسی تھی جو سپاہ خدا تین رات کی
ساحل پہ سر پٹکتی تھیں موجیں فرات کی

10.5.8 حسن تعلیل

کسی بات کا اصل سبب بیان کرنے کے بجائے اس کی شاعرانہ توجیہ کرنا حسن تعلیل ہے۔ انیس کہتے ہیں:

خواہاں تھے نخلِ گلشن زہرا جو آب کے
شبنم نے بھر دیے تھے کٹورے گلاب کے

10.5.9 صنعت عکس وتبدیل

پانی میں آگ، آگ میں پانی خدا کی شان

10.5.10 سیاقۃ الاعداد

کلام میں اعداد کا خوب صورت استعمال کرنا کلام میں حسن پیدا کرتا ہے۔

آواز شش جہت میں تکبیرِ و بزن کی تھی
اللہ کا کرم تھا مدد پنج تن کی تھی

10.5.11 تکرار

الفاظ کی تکرار سے بھی انیس نے کلام میں حسن پیدا کیا ہے مثلاً

حملہ کیا جو تیغ دو دم تول تول کے
ہتھیار سب نے پھینک دیے کھول کھول کے

10.5.12 تشبیہ

کسی چیز کو کسی دوسری بہتر چیز کے مماثل قرار دینا تشبیہ ہے۔ کلامِ انیس خوبصورت تشبیہات سے بھرا پڑا ہے مثلاً

کاٹھی سے اس طرح ہوئی وہ شعلہ خو جدا
جیسے کنار شوق سے ہو خوب رو جدا

10.5.13 استعارہ

مشبہ بہ کہہ کر مشبہ مراد لینا استعارہ ہے مثلاً

تھا شور کہ ہوش اڑتے ہیں یاں کبک دری کے
گھوڑے نہیں جھونکے ہیں نسیم سحری کے

ع بلبل چہک رہا ہے ریاضِ رسول میں

ع شبنم نے بھر دیے تھے کٹورے گلاب کے

اپنی معلومات کی جانچ:

1 انیس کے مرثیوں میں کون کون سی صنعتیں ملتی ہیں؟

2 مبالغہ سے کیا مراد ہے؟

3 تعلّی سے کیا مراد ہے۔ انیس نے اپنی تعلّی کس طرح کی ہے۔

4 تشبیہ سے کیا مراد ہے؟ کلام انیس سے اس کی ایک مثال لکھیے۔

Scanned with CamScanner

بجالانے اور صبر کرنے کی تعلیم کربلائی مرثیے سے بہتر اور کہاں مل سکتی ہے۔

منظر نگاری کے جتنے نمونے مرثیے میں ملتے ہیں وہ اردو شاعری کی کسی اور صنف میں موجود نہیں۔ کہیں صبح کا سہانا منظر دکھائی دیتا ہے، کہیں تپتی ہوئی دوپہر کی تصویر کھینچی جاتی ہے، کہیں شام کا سماں نظر آتا ہے، کہیں گھوڑے اور تلوار کی باریک سے باریک تفصیلات بیان کی جاتی ہیں، کہیں جنگ کی ایسی تصویر کھینچی جاتی ہے کہ صاف تلواریں چلتی نظر آتی ہیں اور خون برستا دکھائی دیتا ہے۔

جذبات نگاری کے جیسے اچھے نمونے ان مراثی میں نظر آتے ہیں وہ بھی کہیں اور نہیں ملتے۔ ہمارے مرثیہ نگار نفسیات کے باقاعدہ علم سے خواہ واقف نہ ہوں لیکن انسانی فطرت کے وہ ایسے نبض شناس تھے کہ اس کی مثالیں کم ملیں گی۔ مرثیے میں طرح طرح کے کردار ہیں اور بے شمار، لیکن فن کار کو ان کے مزاج سے مکمل آگہی حاصل ہے۔

آغاز وارتقا۔۔۔۔ عربوں میں مرثیہ گوئی کا رواج زمانۂ قدیم سے چلا آتا تھا۔ جب کربلا کا سانحہ پیش آیا تو اس کے کچھ ہی دن بعد بعض عرب شعرا نے اس واقعے کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ ایران میں بھی حضرت امام حسین اور ان کے اقربا و رفقا کی شہادت پر مرثیے لکھے گئے اور وہاں مرثیہ نگاری کو خوب فروغ ہوا۔ فارسی شعرا میں محتشم کاشی نے مرثیہ گوئی میں سب سے زیادہ نام پیدا کیا۔

اردو میں شاعری کا آغاز ہوا تو اس صنفِ شاعری کی طرف بطور خاص توجہ کی گئی سترہویں صدی میں نوری نے اردو میں مرثیے لکھے۔ دکن میں گولکنڈہ اور بیجاپور کی سلطنتوں کے عہد میں ہاشم اور ناظم اہم مرثیہ نگار گزرے ہیں۔ شاہی کے مرثیوں نے بھی شہرت پائی۔

مسکین، گدا، سکندر، فضل وغیرہ شمالی ہند کے قدیم مرثیہ گو ہیں۔ ان کی زبان پر قدامت کا رنگ چھایا ہوا ہے۔ ان کے کچھ مراثی غزل کی شکل میں ہیں اور زیادہ تر مربع کی

صورت میں جیسے ؎

مرثیہ ایسا ہے تو نے یہ کہا — جس سے حاصل ہو دو جگ کا مرتبا
ہے یقیں دل پر مرے روزِ جزا — تجھ کو بخشاویں گے شاہِ تاجدار

سوداؔ کے زمانے سے مرثیے کی دنیا میں انقلاب آنا شروع ہوا۔ ان کے مرثیے مختلف ہیئتوں میں پائے جاتے ہیں۔ انھوں نے پہلی بار مسدس کو بھی مرثیے کے لیے اختیار کیا۔ آگے چل کر میر ضمیرؔ نے مرثیے کے لیے اسی کو مخصوص کر دیا۔ انھوں نے مرثیے کے اجزا بھی متعین کیے۔ میر ضمیرؔ اور میر خلیقؔ نے مرثیے کے ایک شاندار عہد کی داغ بیل ڈالی اور اسے ایک مستقل اور باقاعدہ صنفِ سخن کا درجہ عطا کیا۔ اس میں زبان و بیان کی خوبیاں پیدا کیں۔ انیسویں صدی کے آخر میں میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ نے اردو مرثیے کو معراجِ کمال تک پہنچا دیا۔

میر انیسؔ کو زبان پر بڑی قدرت حاصل تھی۔ انھیں انتخاب الفاظ کا سلیقہ آتا تھا اور وہ انھیں موتیوں کی طرح شعروں میں جڑنے کے ہنر سے بھی خوب واقف تھے۔ انسانی نفسیات سے بھی انھیں گہری واقفیت تھی۔ ان کے ہم عصر مرزا دبیر بعض خصوصیات میں میر انیسؔ سے بیشک پیچھے ہیں لیکن بلند تخیل کے مالک ہیں۔ نت نئی تشبیہوں اور استعاروں کی تلاش میں یکتا ہیں۔ رعایت لفظی کی طرف رجحان ہے مگر بین و بکا کی پیش کش میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔

میر انیس کے بعد ان کے چھوٹے بھائی میر محمد نواب مونسؔ نے خاندانی روایت کو جاری رکھا اور مرثیے کہتے رہے۔ اپنے والد میر خلیقؔ کے شاگرد تھے۔ گوشہ نشین قسم کے انسان تھے اس لیے زیادہ شہرت نہیں پائی ورنہ ان کے مرثیے بھی بہت بلند پایہ ہیں۔ زبان کی صحت و صفائی کا خیال رکھتے تھے۔

سید محمد مرزا انسؔ بھی اچھے مرثیہ گو تھے۔ ناسخ کے شاگرد تھے۔ کم کلام شائع

ہوا ہے۔ اس کے بعد سید مرزا تعشق کا ذکر ضروری ہے۔ انیسؔ ان سے بے حد محبت کرتے تھے۔ یہ بھی انیسؔ کی پیروی کو باعثِ افتخار سمجھتے تھے۔ جذبات نگاری، اثر آفرینی، سہل زبان کا استعمال ان کی خصوصیات ہیں۔ شاگردِ ناسخ تھے اس لیے زبان کی رعنائی کا بہت خیال رکھا۔

انیسؔ کے تین بیٹے سلیسؔ، نفیسؔ اور رئیسؔ بھی مرثیے کہتے تھے۔ میر خورشید علی رئیسؔ نے ان میں سب سے زیادہ شہرت پائی۔ اپنے والد کے شاگرد تھے۔ انھی کا اسلوب اختیار کیا۔ میر نفیسؔ کے نواسے سید علی محمد عارفؔ بھی اچھے مرثیہ گو گزرے ہیں۔ انھوں نے اپنے خاندان کا نام روشن کیا۔ پیارے صاحب رشید کو آخری باکمال مرثیہ گو کہا جاسکتا ہے۔ دبیر کے صاحبزادے مرزا محمد جعفر اوجؔ بھی اچھے مرثیہ گو ہوئے ہیں لیکن اصل بات یہ ہے کہ انیسؔ کے بعد کوئی ایسا مرثیہ نگار پیدا نہیں ہوا جو ان پر سبقت لے جاسکتا۔

٭ ٭ ٭

رباعی

رباعی کا ایک نام دوبیتی بھی ہے۔ بیت کے معنی ہیں شعر۔ اس لیے دوبیتی کے معنی ہوئے دو شعروں والی نظم۔ عربی میں ربع کے معنی چار کے ہیں۔ رباعی میں چار مصرعے ہوتے ہیں۔ اس لیے چار مصرعوں والی اس نظم کا نام رباعی ہوگیا۔

رباعی قطعے سے مختلف ہوتی ہے۔ قطعے میں شعروں کی تعداد دو سے زیادہ ہوسکتی ہے لیکن رباعی میں صرف دو شعر یا چار مصرعے ہی ہوتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ رباعی کے پہلے، دوسرے اور چوتھے مصرعے ہم قافیہ یا ہم قافیہ و ہم ردیف ہوتے ہیں۔ رباعی کی خاص شناخت یہ ہے کہ اس کے لیے ایک خاص بحر مقرر ہے جب کہ قطعے کے لیے ایسی کوئی پابندی نہیں۔

رباعی کے سلسلے میں چند اور باتیں بھی اہم ہیں۔ اس میں جو مضمون بیان کیا جائے وہ اچھوتا ہو، جو خیال پیش کیا جائے وہ بلند ہو اور اندازِ بیان میں دلکشی پائی جائے۔ ضروری

Scanned with CamScanner

ہیں کہ کہاں کون سا لفظ موزوں اور مناسب رہے گا۔ گویا فصاحت ان کی زبان کا وصفِ خاص ہے۔ انیس کو اس کا بھی بہت سلیقہ ہے کہ کس موقع پر کس کردار کی زبان سے کیا بات ادا کرائیں۔ اسی کا نام بلاغت ہے۔ اور یہ خوبی بھی ان کے کلام میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔

انیس کے مراثی سے اردو زبان کا دامن بہت وسیع ہوا اور اس میں ہر موقع و محل سے متعلق اظہارِ خیال کی صلاحیت پیدا ہو گئی۔ اردو شاعری میں ابھی تک کسی نے اتنے الفاظ و محاورات استعمال نہیں کیے جتنے انیس نے کیے ہیں۔

انیس نے مرثیے میں رزمیہ کی شان پیدا کی اور اس صنف کو ایسے مقام پر پہنچا دیا کہ ابھی تک اس میں کوئی اضافہ نہیں کیا جا سکا۔

دبیر
۱۸۰۳ء - ۱۸۷۵ء

انیس کے بعد اردو مرثیہ گوئی میں دوسرا مقام دبیر کو حاصل ہے۔ اس لیے ان دونوں کا باہم مقابلہ اور موازنہ کیا جاتا ہے۔ یہ مہمل بات بھی اکثر کہی جاتی ہے کہ انیس کے کلام میں فصاحت ہے تو دبیر کے کلام میں بلاغت۔ فصاحت اور بلاغت کے معنی پر غور کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بیان کس قدر بے معنی اور لغو ہے۔

انیس اور دبیر دونوں اپنے عہد کے بے حد مقبول مرثیہ گو تھے۔ دونوں کے شاگردوں اور پرستاروں کے بڑے گروہ تھے جن کی آپس میں برابر نوک جھونک رہتی تھی مگر دونوں گروہوں نے شرافت کا دامن نہ چھوڑا۔ ان کی چشمک نے انشا اور مصحفی کے معرکوں کا رنگ کبھی اختیار نہیں کیا بلکہ ان کے اختلافات میں ایک ادبی شان برقرار رہی۔

دبیر کا نام مرزا سلامت علی تھا۔ مرزا غلام حسین کے بیٹے تھے۔ ۱۸۰۳ء میں پیدا ہوئے۔ معقول تعلیم و تربیت ہوئی۔ ہوش سنبھالا تو چاروں طرف شعر و شاعری کا ماحول دیکھا، جس میں سب سے زیادہ اہمیت مرثیے کو حاصل تھی۔ کم عمری سے شعر گوئی کی طرف متوجہ ہوئے۔ میر ضمیر کی شاگردی اختیار کی۔ اس وقت عمر صرف پندرہ سال تھی۔ یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ وہ

استاد نصیب ہوا جس نے اردو مرثیے کی بنیادیں استوار کی تھیں۔

آخر کار دبیر نے مرثیہ گوئی میں بلند مقام حاصل کیا اور انیس جیسے کامل فن کے مدِ مقابل ٹھہرے۔ انیس کی طرح دبیر نے بھی بے شمار مرثیے کہے جن میں سے بہت سے ابھی تک شائع نہیں ہوئے اور نہ جانے کتنے تلف ہو گئے۔

شبلی نے ایک کتاب "موازنۂ انیس و دبیر" لکھ کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ انیس دبیر سے بڑے مرثیہ نگار ہیں۔ اس کے خلاف بہت کچھ لکھا گیا لیکن اصلیت یہ ہے کہ دبیر کی چند خامیاں انھیں انیس کے رتبے تک نہیں پہنچنے دیتیں۔ دبیر کی پُرگوئی نے ان کے فن کو نقصان پہنچایا۔ انیس کا قلم بھی بہت زرخیز تھا۔ انھوں نے بھی بہت بڑی تعداد میں مرثیے کہے لیکن ان کے کلام میں ہمواری باقی رہتی ہے اور زیادہ گوئی ان کا عیب نہیں کہی جا سکتی۔ جب کہ دبیر کے مرثیے اکثر جگہ پھیکے پڑ جاتے ہیں۔

دبیر کی علمیت نے بھی ان کے فن کو نقصان پہنچایا۔ وہ جا بجا عربی فارسی کے ثقیل الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔ یہ طبیعت کو ناگوار گزرتا ہے۔ صنعتوں کی کثرت بھی دبیر کے مرثیوں کا اثر کم کر دیتی ہے۔ وہ کوشش کر کے زیادہ سے زیادہ صنعتیں استعمال کرتے ہیں اور رعایت لفظی کے بہت زیادہ شوقین ہیں۔ اس سے دبیر کے مرثیوں میں تصنع اور بناوٹ کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی وہ جزئیات نگاری میں ایسے کھو جاتے ہیں کہ مرثیے کے مجموعی تاثر میں کمی آجاتی ہے۔ ایک اور اہم بات یہ کہ انسانی نفسیات سے واقفیت میں وہ انیس کی ہمسری نہیں کر سکتے۔ انیس نفسیات کے جیسے ماہر ہیں اردو ادب میں اس کی مثال مشکل ہی سے ملے گی۔ دبیر اس میدان میں بہت پیچھے رہ جاتے ہیں اور یہ نہیں سمجھ پاتے کہ کہاں کیا بات کہنے کی ہے اور کیا نہ کہنے کی۔

انیس کی طرح دبیر بھی مرثیہ پڑھنے میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ پڑھنے کے دوران ہاتھ یا چشم و ابرو کا صرف اتنا اشارہ کرتے جتنا مناسب ہوتا اور جس سے اثر میں اضافہ ہو جاتا۔

Scanned with CamScanner

پڑھنے میں جوش ایسا ہوتا کہ مجلس پر سکوت کا عالم چھا جاتا اور جب بین پڑھتے تو سامعین بے اختیار رونے لگتے اور اکثر لوگ تو روتے روتے بے ہوش ہو جاتے ۔

۱۸۵۷ء میں جب ہندوستان کی حالت دگرگوں ہوئی تو مجبوراً دبیر نے اپنا وطن چھوڑا اور سکون کی تلاش میں کئی جگہ پہنچے مگر مصیبتوں میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔ بڑھاپے میں جوان بیٹے کی موت ہوئی۔ ان کی اپنی بینائی جاتی رہی۔ واجد علی شاہ نے علاج کے لیے کلکتہ بلایا۔ آخر بینائی واپس آگئی۔ اسی زمانے میں انیس کا انتقال ہوا۔ دبیر کو ان کی موت کا بھی بڑا غم تھا۔

آخر ۱۸۷۵ء میں دبیر نے لکھنؤ میں وفات پائی اور اپنے مکان ہی میں دفن ہوئے۔ اردو مرثیے میں ان کا نام زندۂ جاوید رہے گا۔ مرثیے کا ایک بند ملاحظہ ہو ؎

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے
رن ایک طرف چرخِ کہن کانپ رہا ہے
رستم کا جگر زیرِ کفن کانپ رہا ہے
خود عرش خداوند زمن کانپ رہا ہے
شمشیر بکف دیکھ کے حیدر کے پسر کو
جبریل لرزتے ہیں سمیٹے ہوئے پر کو

11.4 مراثیِ دبیر کی خصوصیات (۲)

مرزا دبیر بسیار گو اور زود نویس تھے۔ انہوں نے 74 برس کی عمر پائی۔ 12 سال کی عمر سے مرثیے کہنے لگے اور 62 سال تک اسی دشت کی سیاحی کی۔ اس طویل عرصے میں کتنے مرثیے کہے اس کا اندازہ مشکل ہے کیوں کہ ان کا سارا کلام دستیاب نہ ہو سکا۔ بہت سے مرثیے 1857 کے ہنگاموں میں تلف ہوگئے۔ دبیر کے ناقدین اور محققین نے ایک انداز ے کے مطابق ان کے مراثی کی تعداد تقریباً دو ہزار بتائی ہے۔

مرزا دبیر نے اپنے مرثیوں میں صنائع بدائع لفظی اور معنوی کا استعمال بڑی فیاضی سے کیا ہے۔ خوبی یہ ہے کہ اس استعمال سے کلام میں خشکی یا ابہام پیدا نہیں ہوتا بلکہ ایک لطف سا پیدا ہوجاتا ہے۔ مرزا دبیر چوں کہ علم بدیع میں ید طولیٰ رکھتے تھے اس لیے اپنے مراثی میں کئی لفظی اور معنوی صنعتوں کا برمحل استعمال کیا۔ ان صنعتوں میں ایہام، تجنیس، مرعاۃ النظیر، حسن تعلیل وغیرہ وغیرہ کا استعمال کثرت سے کیا گیا ہے۔ جذبات نگاری، منظر نگاری، سراپا نگاری، مکالمہ نگاری، رزم نگاری کے بہترین مرقعے ان کے مرثیوں میں ملتے ہیں۔ مرثیوں سے ان کی علمیت اور لیاقت کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ علمی، فنی اور مختلف علوم کی اصطلاحات اور تلمیحات کے استعمال سے کبھی کبھی ان کے مرثیے بوجھل ہوجاتے ہیں۔ دبیر نے اپنے مرثیوں کے ذریعے اردو کے ذخیرۂ الفاظ میں بے پناہ اضافہ کیا ہے۔

عموماً جذبات نگاری، سراپا نگاری اور رزم نگاری کو دبیر کا امتیازی وصف قرار دیا جاتا ہے۔ دبیر نے مختلف مرثیوں میں سراپے مختلف انداز میں لکھے ہیں۔ اس طرح کہ شخصیت کے نقوش ذہن پر مرتسم ہوجائیں۔ بی بی زینب کے دو صاحبزادے حضرت عون و محمد کی تصویر کشی اس طرح کی ہے:

بُو ہے گُلِ جنت میں یہ رخسار نہیں ہے — ایمن میں تجلّی ہے یہ دیدار نہیں ہے
قد رکھتا ہے طوبیٰ تو یہ رفتار نہیں ہے — شیریں لب کوثر ہے یہ گفتار نہیں ہے
آئینہ میں رُو ہے یہ خط سبز کہاں ہے
غنچے کے دہن ہے نہ زباں ہے نہ بیاں ہے

دبیر کا رزم نگاری میں بھی پلہ بھاری ہے۔ رزم نگاری صرف میدان جنگ میں معرکہ آرائی کا نقشہ کھینچنے کا نام نہیں ہے بلکہ آمد، رجز جنگ بھی رزم نگاری میں آتے ہیں۔ رزم نگاری کو دبیر نے بڑی وسعت دی ہے۔ ہیرو کی میدان جنگ میں آمد ہو کہ معرکہ آرائی، دبیر ہر موقع پر ایسی کیفیت پیدا کردیتے ہیں کہ نقشہ آنکھوں میں گھوم جاتا ہے۔ دبیر نے رزم میں جذبات نگاری کا بھی بڑا اہتمام کیا ہے۔ مرثیۂ حضرت عباس میں آمد کا یہ حال دیکھیے کہ جس سے پوری جنگ کی کیفیت سامنے آجاتی ہے یعنی آمد ایسی ہو تو جنگ کیسی ہوگی!

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے — رستم کا جگر زیر کفن کانپ رہا ہے
ہر قصر سلاطین زمن کانپ رہا ہے — سب ایک طرف چرخ کہن کانپ رہا ہے
شمشیر بکف دیکھ کے حیدر کے پسر کو
جبریل لرزتے ہیں سمیٹے ہوئے پر کو

اردو مرثیے کو دبیر نے علمی وقار دیا ہے۔ ان کے مراثی میں واقعات اور روایات کا ایک بیش بہا خزانہ ہے۔ انہوں نے تاریخ، روایات اور معتقدات سے تلمیحات چن چن کر استعمال کیے۔ قرآنی آیات اور احادیث سے اپنے اشعار کو زینت دی ہے۔

اس بند کے ہر مصرع میں ایک تلمیح باندھی ہے۔ تلمیح کا لطف اس وقت تک نہیں آتا جب تک کہ ہم اس واقعہ سے واقف نہ ہوں۔

روکش ہے اس ایک تن کا نہ بہمن نہ تہمتن — سہراب و نریمان وپشن بے سر و بے تن
قاروں کی طرح تحت زمین غرق ہے قارن — ہر عاشق دنیا کو ہے دنیا چہ بیژن
سب بھول گئے! اپنا حسب اور نسب آج
آتا ہے جگر گوشۂ قتال عرب آج

اس بند میں دبیر نے حضرت عباس علمدار کی بہادری، بے جگری اور طاقت کے اظہار کے لیے شاہنامے سے تلمیحات منتخب کی ہیں۔
مرزا دبیر کے مرثیوں میں فصاحت بھی اپنا رنگ دکھاتی ہے۔ ایک مرثیہ میں حضرت امام حسین کی رجز خوانی دیکھیے:

فوج اس کے پاس بھی ہے پہ فوج خدا کہاں
صاحب علم ہزار پہ عباس سا کہاں
بیٹے بہت، پہ اکبر گلگوں قبا کہاں
لاکھوں میں ایک ثانی خیرالوریٰ کہاں
بھائی یزید کا کوئی مثل حسن بھی ہے
زینب سی عابدہ کوئی اس کی بہن بھی ہے

دبیر نے بے حساب صنعتیں برتی ہیں مثلاً ردالعجز علی الصدر یعنی جو الفاظ پہلے مصرعے کے آخر میں آتے ہیں، وہی دوسرے مصرعے کے شروع میں لائے جائیں:

الفت شعار ہوں کہ میں عاشق خدا کا ہوں
عاشق خدا کا ہوں کہ میں دل مصطفےٰ کا ہوں

صنعت غیر منقوط میں، جس میں ایک حرف بھی نقطہ والا نہ ہو، دبیر کا پورا ایک مرثیہ ہے۔ اس میں اپنا تخلص عطارد باندھا ہے۔ ایک بند پیش ہے جو دلچسپی اور حیرت سے خالی نہیں:

حُر حملہ ور ہوا کہ اسد حملہ ور ہوا
وہ حملہ ور اِدھر، اُدھر اسلام ور ہوا
سرگرم معرکہ سرِ اعدا اگر ہوا
وہ گل کھلا کہ لالہ کہسار سر ہوا
اہل حسد کو درس اِدھر آہ آہ کا
حُور و ملک کو ورد ادھر واہ واہ کا

صنعت لف ونشر مرتب: لف کے معنی لپیٹنا اور نشر کے معنی پھیلانا ہے۔ ایک مصرعے میں کچھ لفظ لائے جائیں اور دوسرے مصرعے میں اسی ترتیب سے وضاحتی الفاظ رکھے جائیں تو اسے لف ونشر مرتب کہتے ہیں۔

بازار گل و موج صبا سرد ہے اس سے
وہ داغ ہے وہ آب ہے وہ گرد ہے اس سے

دبیر کے دور کا لکھنو صنعتوں میں ڈوبا ہوا تھا اور اس میں سب سے زیادہ رعایت لفظی سے کھیلا جاتا تھا۔ دبیر نے بھی اپنے مرثیوں میں اس صنعت سے خوب کام لیا ہے۔ ان کا ایک مشہور مرثیہ ہے جس کے مطلع میں خیاطی کی رعایتیں ملحوظ رکھی گئی ہیں۔ صرف ایک شعر پیش ہے:

فکر رفو تھی چرخ ہنر مند کے لیے
دن چار ٹکڑے ہوگیا پیوند کے لیے

ایک مرثیہ میں دبیر نے تو تمام صنعتیں ایک ساتھ نظم کردی ہیں اُس مرثیہ کا مطلع ہے:

لعل لب شبیر گہر بار ہے رن میں
نیساں برستا ہے شہادت کے چمن میں

دبیر نے تشبیہات و استعارات میں بھی ندرت پیدا کی ہے، آنکھ کو نرگس سے سبھی شاعروں نے تشبیہ دی ہے مگر دبیر اس تشبیہ کو "عین حقارت" سمجھتے ہیں۔

گر آنکھ کو نرگس کہوں ہے عین حقارت
نرگس میں نہ پلکیں ہیں، نہ پتلی نہ بصارت

موازنہ انیس و دبیر

اردو شاعری میں انیس کی شخصیت بہت بلند اور نمایاں ہے، انھوں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں اور فکروفن کی وسعتوں سے صرف مرثیہ ہی کو عظمت و توانائی نہیں بخشی ، بلکہ اردو شاعری کو بھی ہر پہلو سے گراں قدر اور باوقار بنایا۔ مرثیہ جو پہلے بگڑے ہوئے شاعر کے فن سے تعبیر کیا جاتا تھا، میرانیس کی کوششوں سے اردو شاعری کی آبرو بن گیا اور خود میرانیس نے اس فن کی بدولت عظیم شاعروں کی صف اول میں نمایاں مقام حاصل کیا۔ علامہ شبلی ''موازنہ'' کی تمہید میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اس بنا پر مدت سے میرا ارادہ تھا کہ کسی ممتاز شاعر کے کلام پر تقریظ وتنقید لکھی جائے، جس سے اندازہ ہوسکے کہ اردو شاعری باوجود کم مائگی زبان کیا پایہ رکھتی ہے، اس غرض کے لئے میرانیس سے زیادہ کوئی شخص انتخاب کے لئے موزوں نہیں ہوسکتا تھا کیوں کہ ان کے کلام میں شاعری کے جس قدر اصناف پائے جاتے ہیں اور کسی کلام میں نہیں پائے جاتے۔''

میرانیس کی قدر ہر زمانے میں رہی، لیکن اس قدر دانی میں انیس کی فنی عظمت سے کہیں زیادہ لوگوں کی مذہبی خوش اعتقادی کا ہاتھ رہا، میرانیس کو خوش اعتقادی کے دائرے سے نکال کر نکتہ دانوں اور نقادوں کے حلقے میں روشناس کرانے کا کارنامہ علامہ شبلی نے ''موازنہ انیس و دبیر'' لکھ کر انجام دیا۔ مرثیہ، مرثیہ نگاروں اور میرانیس سے متعلق آزاد نے آب حیات میں اور حالی نے 'مقدمہ شعروشاعری' میں بحث کی ہے، لیکن جس سنجیدہ اور عالمانہ انداز میں علامہ شبلی نے بحث کی ہے، اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔

''موازنہ انیس ودبیر'' نظریاتی وعملی تنقید کا بہترین نمونہ ہے، پہلے علامہ شبلی شاعری، لوازمات شاعری، تشبیہ اور استعارہ، قافیہ اور ردیف، محاکات وتخیل، لفظ ومعنی کا باہمی ربط اور فصاحت وبلاغت پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہیں اور ساتھ ہی انسانی احساسات وجذبات، منظر نگاری، واقعہ نگاری، رزمیہ

Scanned with CamScanner

رزمیہ شاعری جیسے اہم موضوعات سے بھی بحث کرتے ہیں پھران تنقیدی اصولوں کی روشنی میں انیس و دبیر کی شاعری کا جائزہ لیتے ہیں، اس طرح علامہ شبلی پیروئ مغربی کرنے کے بجائے عربی و فارسی تنقیدی نظریات کو اپنا رہ نما بناتے ہیں۔ اپنے ہم عصروں میں علامہ شبلی غالباً ایسے تنہا شخص ہیں جو مغربی علوم و نظریات سے مرعوب ہوئے بغیر پوری خود اعتمادی کے ساتھ مشرقی شاعری اور اس کی روایتی تنقید کے اصولوں کو دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں اور ادبی تخلیقات کو پرکھنے کے لئے انھیں اپنا معیار بناتے ہیں۔
علامہ شبلی نے بحث کے جو عنوانات قائم کئے ہیں ان پر ایک نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ شبلی رموز شاعری سے کتنے زیادہ آگاہ تھے اور انھوں نے کتنے وسیع پس منظر میں شعر اور موضوعات شعر سے بحث کی ہے فہرست مضامین حسب ذیل ہے۔

> ''کلام کی فصاحت، کلام کی اصل ترتیب کا قائم رہنا، مضامین کی نوعیت کے لحاظ سے الفاظ کا استعمال، بحر و ردیف و قافیہ کی موزونی، بلاغت کے جداگانہ طریقے، تسلسل بیان، استعارات و تشبیہات، صنائع و بدائع، جذبات انسانی اور اس کی مثالیں، مناظر قدرت، واقعہ نگاری، رزمیہ''۔

کسی بھی فن پارے کو پرکھنے کے لئے یہ بہترین تنقیدی اصول ہیں، شبلی نے انھیں اصولوں کی روشنی میں اعلیٰ شاعری کے محاسن کا سراغ میر انیس کے کلام میں لگانے کی کوشش کی ہے وہ روایتی انداز سے بندھے ٹکے اصولوں کے مطابق کوئی تنقیدی فیصلہ صادر کرنے کے بجائے لفظ و معنی کی روح میں اتر کر کوئی فیصلہ کرتے ہیں۔ مولانا کی اس تنقیدی روش سے بہت سی ایسی غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جاتا ہے جو علمی حلقوں میں پائی جاتی تھیں۔ مثال کے طور پر شاعرانہ حلقوں میں یہ فقرہ ضرب المثل ہو کر رہ گیا تھا کہ ''میر صاحب میں فصاحت زیادہ ہے اور مرزا صاحب میں بلاغت'' مولانا نے فصاحت و بلاغت کی توضیح و تشریح بالکل نئے انداز میں کی اور ثابت کیا کہ بلاغت کے معنی ؛ معنی بندی اور مضمون آفرینی یا ایراد ایجاز نہیں بلکہ بلاغت یہ ہے کہ کلام فصیح ہو اور اقتضائے حال کے مطابق ہو۔ اس طرح فصاحت و بلاغت ایسی صفتیں نہیں جو ایک دوسرے کے مقابل واقع ہوں بلکہ فصاحت بلاغت کی شرط اول ہے اور کلام فصیح کا اقتضائے حال کے مطابق ہونا، اس میں بلاغت پیدا کرتا ہے۔ علامہ نے فصاحت و بلاغت کی تشریح کرنے کے بعد میر انیس اور مرزا دبیر کے کلام سے مثالیں پیش کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ میر انیس نے دبیر کے مقابلے میں واقعات کی فطری صورتوں اور امکانی پہلوؤں کو زیادہ مدنظر رکھا ہے اور کہیں بھی انھیں غیر فطری رنگ اختیار کرنے نہیں دیا۔ اسی طرح تسلسل کلام، لفظوں کی موسیقی اور زبان کی

شیرینی اور گھلاوٹ کے اعتبار سے بھی میر انیس کو مرزا دبیر پر فوقیت دی ہے۔

بہت ممکن ہے کہ اس کتاب میں تحقیق کی کچھ خامیاں ہوں اور نقادوں کے اس خیال میں بھی کسی حد تک صداقت ہو کہ میر انیس شبلی کے ہیرو تھے اور اکابر پرستی (Hero Worship) کے جذبہ کے تحت میر انیس کی برتری ثابت کرنے کے لئے دبیر کو گرانے کی شعوری کوشش کی ہے، اس مقصد کے پیش نظر میر انیس کے بہترین اشعار کے مقابلے میں دبیر کے کمزور اشعار پیش کئے ہیں۔ اسی طرح بعض ایسے اشعار دبیر کی طرف منسوب کر دیے ہیں جو سرے سے دبیر کے ہیں ہی نہیں۔ مثال کے طور پر علامہ شبلی نے دبیر کی طرف یہ مصرع منسوب کیا ہے۔

زیر قدم والدہ فردوس بریں ہے

یہ مصرع دبیر کا نہیں بلکہ ان کے شاگرد حکیم قدیر علی لکھنوی کا ہے، اسی طرح شہر بانو کی زبان سے ادا ہونے والا نوحے کا مصرع بھی دبیر کے دیوان میں نہیں ملتا۔

ہے ہے مرے دیور، مرے دیور مرے دیور

مشہور محقق محمود شیرانی نے علامہ شبلی کی تحقیقی غلطیوں کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے، اس کے علاوہ ''ردالموازنہ''، ''تردید الموازنہ'' اور ''المیزان'' جیسی کتابیں لکھی گئیں جن کی حیثیت اب صرف تاریخی ہو کر رہ گئی ہے۔

ان فروگزاشتوں اور تاریخی غلطیوں کے باوجود ''موازنہ انیس و دبیر'' آج بھی انیس شناسی کے سلسلے میں ایک بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری اس حقیقت کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

> ''آج میر انیس کی شاعرانہ عظمت کا جو سکہ ہمارے دلوں میں بیٹھا ہوا ہے اور عام و خاص میں انھیں جو شہرت حاصل ہے، ان میں سب سے زیادہ حصہ مولانا شبلی ہی کا ہے، مولانا حسین آزاد اور مولانا الطاف حسین حالی نے میر انیس کا تذکرہ ضمناً کیا تھا۔ مولانا شبلی نے میر انیس پر ایک بھرپور کتاب ''موازنہ انیس و دبیر'' کے نام سے لکھ دی۔ میر انیس کی شہرت ''موازنہ'' کے پہلے بھی تھی لیکن اتنی نہیں۔ یہی حال دبیر کا بھی تھا۔''

☆☆☆